قرۃ العین حیدر

میرے بہترین افسانے

میرے بہترین افسانے

نئے اور منتخب افسانوں کا مجموعہ

میرے بہترین افسانے

افسانے

قرۃ العین حیدر

رفعت پبلشرز

شاہراہ قائدِ اعظم۔ لاہور

پبلشرز : ریاض شاد۔ مالک رفعت پبلشرز۔ لاہور
پرنٹرز : الطاف پرنٹرز۔ لاہور
بار : اوّل ۱۹۸۱ء
تعداد : ایک ہزار
قیمت : بارہ روپے پچاس پیسے

انتساب

گم شدہ زمانوں کے نام ——
جن کی تلاش میں ابھی نہ جانے
اور کتنے زمانے گزر جائیں ——

—— قرۃ العین حیدر

پاکستان میں قرۃ العین حیدر کے بارہ میں بعض حلقوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ انہوں نے لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ کارِ جہاں دراز ہے۔ "آخرِ شب کے ہمسفر" کے علاوہ "اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو" ان کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ اور اس کتاب کا نام یہاں کتنے لوگوں کو معلوم ہوگا۔

صالحہ عابد حسین

دلی۔

فہرست

- تاریخ کی شاعرہ
- چاندنی میں شکار
- جن بولو - تارا - تارا
- اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو
- روشنی کی رفتار
- پرانی کہانی
- یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے

تاریخ کی شاعرہ

جدید افسانوی ادب میں قرۃ العین حیدر کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم عصر ادیبوں بالخصوص افسانوی ادب سے متعلق شخصیات میں انہیں یہ امتیاز حاصل ہے کہ زبان و ادب کی مشرقی روایات کے ایک رچے ہوئے شعور کے ساتھ وہ مغرب کی فنی اور تہذیبی روائتوں سے تخلیقی سطح پر استفادہ کرسکنے کی حد تک واقف ہیں۔ اور اس حقیقت سے بھی بہر نوع انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ترقی پسند تحریک کے عروج کے دنوں میں اس امر کے باوجود کہ ان کے تخلیقی فیضان کا ایک اہم سرچشمہ حقیقت کا معاشرتی شعور ہے۔ انہوں نے تکنیک اور موضوع دونوں ہی سطحوں پر ہم عصر مغربی ادب کے بعض عناصر مثلاً داخلی تجربے کا آزاد اور ظاہری طور پر پلاٹ سے غیر مربوط اظہار، نیز ماورائیت کی طرف رجحان کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا تخیلی فیضان بنیادی طور سے عمرانی ہے۔ اور ایک لحاظ سے عبد الحلیم شرر اور پریم چند کی روایت سے منسلک ہے۔ ظاہر ہے کہ فنی ارتفاع کے حصول کے نقطۂ نظر سے اس روایت کو خاصی نظریاتی دشواریوں کا سامنا ہے۔ ارسطو کے نظریۂ تعالیت کو فطرت کی بعینہٖ عکاسی کے الزام سے بچانے کے لئے جن احتیاطی دلائل کو استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کے حوالے کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حقیقت نگاری پر مشتمل بیانیہ کی روائت واقعیت کو قلمبند کر لینے پر ہی اکتفا کرنا چاہتی ہے۔ لیکن ایسا صرف نظریاتی سطح پر ہی ہوتا ہے۔ عملی طور پر فنکارانہ تخیل ایک غیر شعوری انداز میں تسلسل کے اندر نظم۔ واقعہ میں معنی اور تغیر پذیر زمانی اور مکانی ہیولوں میں ایک مستمر اور ابدی حقیقت کا عکس تلاش کر لیتا ہے۔ اور یہی حقیقت نگاری کے زیر اثر تخلیق کئے جانے والے فن پاروں کی ادبی اہمیت کا ضامن ہے۔

قرۃ العین حیدر بنیادی طور پر تاریخ کی شاعرہ ہیں۔ وہ سوانحی مواد کو دل پذیر بنا سکے۔ وہ جزئیات کے ڈرامے پر پورا عبور رکھتی ہیں۔ وہ تفصیلات کو معنی خیز انداز میں باہمی تقابل کی خاطر پیش کر سکتی ہیں۔ وہ واقعیت کو اپنے مخصوص "تاریخی شعور" کی مدد سے ایک شفاف حقیقت میں منقلب کر سکتی ہیں۔ جو چاہے کسی وقیع اور ہمہ گیر حقیقت کا حصہ نہ بھی ہو۔ لیکن انفرادی طور پر اہم یا کم از کم ایک یادگار رمز ور بن جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر دراصل حقیقت کو ہی اپنے تخیل کا محور سمجھتی ہیں۔ ڈاکومنٹری تکنیک کے علاوہ سینما کے متحرک بصری پیکروں اور سینما ہی کے آسان اور مبالغہ آمیز جذباتی اور فکری

عناصر کی مدد سے اپنی افسانوی فضا تخلیق کرتی ہیں۔ زمان و مکان اور مخصوص تہذیبی پس منظر کی عکاسی ان کے ہاں سب کہانیوں میں آتنی ہی خوبصورت۔ دلکش اور مستند ہے۔ جیساکہ شروع کی تخلیقات میں۔ معاشرتی حقیقت نگاری کے ان نمونوں کا اگر تفصیلی تجزیہ پیش کیا جائے تو ایک دفتر درکار ہے۔ جو نہ یہاں مقصود ہے۔ نہ یہ مختصر سطور اس کی متحمل ہوسکتی ہیں۔

مقبول حسن خان
شعبہ انگریزی مسلم یونیورسٹی۔
علی گڑھ

علی گڑھ
اپریل ۱۹۷۹ء

چاندنی میں شکار

ہمالیہ اور شوالک کی درمیانی وادیاں "دون" کہلاتی ہیں (جن میں سے ایک ڈیرہ دون ہے)
سوا سو مربع میل پر پھیلا ہوا کوربٹ نیشنل پارک بھی ضلع نینی تال کی ایک دون میں واقع ہوتی ہے
رام گنگا پہاڑوں سے اُتر کر ربٹ نیشنل پارک میں داخل ہوتی ہے۔ اس کے ایک کنارے پر پہاڑی
سلسلہ ہے۔ دوسرے پر سال کا گھنا بن — جنگل میں شیر اور چیتے اور ہرن رہتے ہیں۔ رام گنگا میں
گھڑیال، جو ہمارے وقت سے علیحدہ اجیولوجیکل ٹائم اور ڈینوساروں کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔
ہاتھیوں اور دریائی گھوڑوں کی طرح، جب کوئی جیپ جنگل کی سڑک پر سے گزرتی ہے اس
کی آہٹ پر شیر اور چیتے، چیتل اور سانبھر اور نیل گائیں چشم زدن میں غائب ہو جاتی ہیں۔ محض
پتوں کی سرسراہٹ، یا ایک جھلک یا ایک پرچھائیں، جیسے انسانی دماغ کے اندرونی جنگل میں
چھپا کوئی خیال اور کبھی رات کے وقت جیپ یا کار کی ہیڈلائٹس کی زد میں بیٹھا ہنستا ہوا

لکڑبگا یا اور بلاؤ یا سیاہ ریچھ دکھائی دے جاتا ہے۔ جیسے کوئی انجانا خوف اچانک مجسم ہو جائے۔
ہرنوں، رنگ برنگے پرندوں اور سانپوں سے بھرے گھرے بَن پر چھائی ہوئی گھپ اندھیری رات کا راگ، بہتے دریا اور سوتے گھڑیالوں اور پرندوں اور درندوں اور برفانی سردی اور متحرک کہرے اور تاریکی کی بے آواز سنفنی۔

اس سال دسمبر کے مہینے میں جنگل کے کنارے ریسٹ ہاؤس کے کمپاؤنڈ میں حسب معمول بھانت بھانت کے لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اپنی کارواں کار میں انگلستان سے آیا ہوا ایک ریٹائرڈ فوجی افسر اور اس کی میم، کیمبرج یونیورسٹی کے طلبا جو ہمالیہ کی نباتات کے مطالعہ کے لئے آئے تھے۔ چند یورپین نوجوانوں، یہ سب خیموں میں مقیم تھے۔ کچھ فاصلے پر چند چھولداریوں میں وہ ٹھیکیدار اور مزدور کمپاؤنڈ میں نئی عمارتیں تعمیر کر رہے تھے۔ کوربٹ نیشنل پارک میں سیاحوں کی آمد و رفت بڑھتی جا رہی ہے۔

چیف مہاوت ڈنر کے بعد سارے ہاتھیوں کو لے کر آتا۔ جو گھٹنے ٹیک کر مغربی سیاحوں کو سلامی دیتے اور میمیں ہاتھیوں کو ایک ایک روٹ کھلاتیں اور پھر سب اپنے اپنے کمروں اور خیموں اور کوارٹروں اور جھونپڑیوں اور بلوں اور بانبیوں اور کچھاروں اور آبی غاروں اور گھونسلوں میں جا کر سو رہتے اور صبح کو رام گنگا پر سورج جھانکتا اور جنگل جاگتا اور احاطہ جاگتا اور سب زندہ ہرنوں اور زندہ بکروں اور مردہ بھینسوں (اور کبھی کبھار انسانی لاشوں) اور کچے گوشت اور کیڑے مکوڑوں اور کینچووں اور تلے ہوئے انڈوں اور پوریج اور کورن فلیک، اور ٹوسٹ جام جیلی، مارملیڈ اور چائے، کافی یا پوری، بھاجی یا خاگینہ، پراٹھے یا سوکھی روٹی کا ناشتہ کر کے

اپنا اپنا دن شروع کرتے۔

اور تب دبے پاؤں بدھو احاطے میں داخل ہوتا وہ نئی عمارت کے نیچے جا کھڑا ہوتا اور رام پوری بیرا آواز دیتا۔ بدھو آگیا، اور سڑک پر ٹہلتی ہوئی معمر مسز فری مینٹل کہتیں "ہلو لوڈو، گڈ مورننگ" اور بریگیڈیر فری مینٹل غراتے "ہائی بوڈو" "اولڈ راسکل" اور امریکن سیاح مسکرا کر کہتے "ہائی بوڈو" اور کوئی امریکن لڑکی پکارتی "ازنٹ ہی کیوٹ؟"

بدھو دو مرتبہ کمپاؤنڈ میں آتا ہے، صبح کو ناشتہ کرتا ہے۔ واپس چلا جاتا ہے۔ رات کو کھانا کھا کر پھر واپس۔

شام ہوئی۔ اس کہر آلود شام ایک سبز رنگ کی جیپ اسٹیشن ویگن آکر نئی عمارت کے سامنے رکی دو مرد اور ایک عورت اس میں سے اُترے۔ نئے ریسٹ ہاؤس کے ملازموں نے دوڑ دوڑ کر اسباب اتارا، کیونکہ وہ بہت متمول سیاح معلوم ہوتے تھے، امریکن میچنگ کا سنی پھول دار سوٹ کیس، ہولڈال اور بیگ، پڑھیا پکنگ باسکٹ، وہ تینوں استقبالیہ کمرے میں داخل ہوئے جس کے ایک کمرے میں بھدی چمکیلی بار بنادی گئی تھی۔ لڑکی نے ابرو اٹھا کر ناگواری سے چاروں طرف نظر ڈالی جیسے وہ صرف پانچ ستاروں والے ہوٹلوں کی عادی ہو۔

بار پر بریگیڈیر فری مینٹل تنہا بیٹھا تھا۔ نو واردوں میں سے ایک بار کی طرف آیا۔ بودھپورز میں ملبوس، سر پر صافہ ایک کان میں سوراخ، نوکیلی مونچھیں کر ایسے کردار ردسل کھنڈ کے افسانوی خطے میں آج بھی نظر آتے ہیں۔ اس نے انگلی اٹھا کر پہاڑی لڑکے سے کہا "ایک برانڈی اور سوڈا" اور عنابی چمڑے کے اسٹول پر ٹک گیا۔ چند منٹ بعد اس نے بریگیڈیر پر نظر ڈالی اور اسے اپنی

طرف متوجہ کرنا چاہا مگر بریگیڈیئر نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ کسی بھی سفید فام مغربی کی موجودگی میں ہندوستانی عموماً بے حد کوشش ہو کر عجیب لہجے میں انگریزی بولنے لگتے ہیں اور بہت فخر کرتے ہیں کہ گوری چمڑی والے سے ہم کلام ہیں اور ان کے پورے انداز میں ایک عجیب لجاجت اور مسکینی آجاتی ہے۔ اہلِ مغرب اس وقت دل میں ان پر ہنستے ہیں۔ اور یہی لوگ اپنے ہم وطنوں سے عموماً سخت کلامی سے پیش آنے کے عادی ہوتے ہیں۔

دوسرا آدمی دبلا پتلا، بستہ قد اور گنجا تھا اور اس کی کاہل غلافی آنکھیں SLOTH BEAR ریچھ) کی آنکھوں سے مشابہ تھیں۔ جنہیں وہ بڑی سستی سے گھماتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور ریسٹ ہاؤس کے منیجر سے مصروف گفتگو تھا۔ لڑکی اکتائی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ کوئی سینما اسٹارلٹ معلوم ہوتی تھی یا کوئی کامیاب۔ مہنگی، نیشن موڈل، خوش شکل، کھلتی رنگت، صحت مند، دراز قد، شربتی آنکھیں، اس نے بیش قیمت ہیرے پہن رکھے تھے۔ ناٹا آدمی عمر میں اس سے دوگنا نظر آتا تھا۔ چند منٹ بعد وہ دونوں اوپر چلے گئے۔ کن چھدا آدمی بار پر برانڈی پیتا رہا۔ باہر سے شیروں کے دھاڑنے کی آواز آئی۔

افسوس کہ یہ لاجواب ٹائیگر کنٹری اب کالاگڑھ ڈیم میں ڈوب جائے گی" کن چھدے آدمی نے کہا۔

" مجھے بھی افسوس ہے " بریگیڈیئر نے مختصر جواب دیا۔

" میں بڑے بڑے رؤسا کو شکارگاہوں پر لے جاتا رہا ہوں، وہ زمانے لد گئے، آپ؟ "

" مچھلی کے شکار کے لئے ہر سال انگلستان سے آتا ہوں " بریگیڈیئر نے جواب دیا۔

آپ کی کوئی خدمت کر سکوں تو حاضر ہوں۔ کن چھدے آدمی نے کہا۔

"نہیں شکریہ" بریگیڈیئر نے رکھائی سے جواب دیا۔

باہر رات کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ کن چھدا آدمی بریگیڈیئر کو گھورنے لگا۔ اس کی آنکھ، صرف ایک آنکھ سرخ ہو چکی تھی "ترائی کا یہ علاقہ بہت رومینٹک علاقہ ہے" اس نے کہا "اگر آپ۔۔۔۔"

یہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے جو خواہ مخواہ کسی سفید فام مغربی سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" بریگیڈیئر نے سوچا اور اسٹول پر سے اٹھا۔ چرٹ سلگایا اور اسے "گڈ نائٹ" کہہ کر سرعت سے باہر نکل آیا۔

کن چھدا آدمی بار کی سطح پر طبلہ بجانے لگا۔ اس نے گلاس ختم کیا اور بار مین سے بولا "بل اوپر بھیج دینا جو میم صاحب کے ساتھ آئے ہیں، زینہ کدھر ہے؟"

بار مین نے راستہ بتایا۔

اوپر پہنچ کر کن چھدے آدمی نے ایک دروازے پر دستک دی، اندر سے آواز آئی "آجاؤ"۔ دروازہ کھلا ہے۔ وہ اندر گیا، لڑکی مسہری پر نیم دراز جم کوربٹ کی "کمایوں کے آدم خور" کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ جو سیاحوں کے لئے ہر کمرے میں موجود تھی، ناٹا آدمی دوسرے پلنگ پر لیٹا چھت کو تک رہا تھا "جاؤ" اس نے تھکا نہ آواز میں کہا۔ جو اس کے نحیف سراپا سے لگا نہ کھاتی تھی۔

"ٹھیک ہے، میں راتوں رات ڈھکالا سے نکل جاؤں گا۔ آپ مجھے نجیب آباد۔۔۔"

"جاؤ!" ناٹے آدمی نے اس کی آواز کاٹی۔

"گڈ نائٹ" کن چھدرے آدمی نے لڑکی کو مخاطب کیا۔ "اتوار کو صبح کو آؤں گا" تیار رہنا۔

"جاؤ!" ناٹے آدمی نے دہرایا۔

کن چھدرے آدمی نے جھک کر سلام کیا اور باہر چلا گیا۔

ناٹے آدمی نے اُٹھ کر ایک سوٹ کیس کھولا، اس میں سے چمڑے کی پیٹی نکالی اور ایک چابک، اس نے دونوں چیزیں لڑکی کی طرف پھینکیں اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

صبح سویرے مسز فری مینٹل کارواں کار کے سامنے کپڑے دھو کر الگنی پر ٹانگ رہی تھیں، ان کے شوہر نزدیک کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھنے میں مشغول تھے، دفعتاً وہ بولیں "پور گرل، پُور تھنگ!"

بریگیڈیر خاموش رہے

انڈین چائلڈ برائیڈ بے چاری! کیا ہم اس کے لئے کچھ کر نہیں سکتے ہنری؟"

"کیا ہے ڈورس؟" بریگیڈیر نے ذرا جھنجھلا کر پوچھا۔

"وہ لڑکی جو کل رات بے چاری یہاں آئی ہے، وہ صبح شال اوڑھے اس طرف چہل قدمی کر رہی تھی، ساڑھی کے نیچے اس کی پیٹھ پر چابک کے نشان نظر آرہے تھے۔ اس کا شوہر اسے مارتا ہے کیا ہم...."

"ڈورس، دوسروں کے معاملات میں ناک مت ڈبوؤ۔"

"لیکن ہنری...."

صبح کو گیارہ بجے کے قریب لڑکی اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے تیار ہو رہی تھی۔ اس نے

باقاعدہ سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ ناٹا شوقین آدمی تھا۔ وہ بالوں کی کھچڑی جھالر میں سولس پین
ٹین لگاتے ہوئے لہک لہک کر گاتا جاتا تھا۔

"دل جنگل ہی میں بہلتا ہے"۔

"یہاں حسن پہ عشق مچلتا ہے ...."

لڑکی غور سے اس کا گانا سن رہی تھی۔

"یہ گانا جب تم پیدا نہیں ہوئی ہوگی تب کا ہے۔" اس نے کیمرہ اور دوربین اٹھاتے ہوئے کہا۔

دونوں باہر آئے، دروازے میں تالا لگایا۔ نیچے اُترے اور ہاتھی کے چبوترے کی طرف بڑھے
سیڑھیاں چڑھ کر پلیٹ فارم کے اوپر پہنچے اور ہتھنی پر سوار ہوتے ہوئے جو کار کی طرح پلیٹ فارم
سے لگی کھڑی تھی۔

ہودے میں بیٹھ کر لڑکی کھلکھلا کر ہنسی، وہ بچوں کی طرح خوش تھی۔ دھوپ میں اس کے ہیرے
[illegible] رہے تھے۔ گندا، بوسیدہ خاکی کوٹ پہنے ہوئے منحنی مہاوت نے انکس سنبھال کر ہتھنی کو آہستہ
سے پچکارا "چل بٹیا رام کلی، بسم اللہ!"

رام کلی پھاٹک کی طرف چل پڑی۔

[illegible] سے نکل کر وہ رام گنگا کے ایک اتھلے حصے پر سے گزرتے جنگل کی طرف بڑھے۔ لڑکی
[illegible] حسرت سے دوربین کے ذریعہ چاروں طرف دیکھتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار ناٹے آدمی سے
کہتی [illegible] وہ دیکھو مور ۔ ارے! بارہ سنگھا ۔ وہ دیکھو گھڑیال، مائی گاڈ۔ کتنا بڑا مگرمچھ وہ دیکھو
وہ کیا ہے مہاوت میاں؟"

"سانبھر میم صاحب۔ بولئے مت، آواز سنتے ہی سب غائب ہو جاتے ہیں۔"

رام کلی جنگل میں پہنچی۔ جہاں بئے کے ان گنت گھونسلے پیڑوں میں قندیلوں کی طرح آویزاں تھے۔ دور سے انہیں دو ہاتھی اور نظر آئے جن پر کیمبرج سے آئے ہوئے انگریز طلبا سوار تھے۔

جنگل کے ایک حصے کا چکر لگا کر سدھی ہوئی۔ رام کلی واپس مڑی۔ ریسٹ ہاؤس پہنچ کر لڑکی نے فیل بان کو بیس روپئے بخشش دیئے۔ کمپاؤنڈ کے عملے میں لڑکی کی امارت اور دریا دلی کا شہرہ ہو چکا تھا۔ ایک بیرے نے اسے خوش کرنے کے لئے آگے بڑھ کر کہا" وہ دیکھئے میم صاحب بدھو آگیا۔

بدھو! اسے جانے نہ دینا۔ میں اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤں گی۔" لڑکی نے کہا اور ڈائننگ ہال کی طرف چلی گئی۔

ڈائننگ ہال ڈیپریسنگ تھا۔ لڑکی، جو جنگل میں بہت خوش نظر آرہی تھی۔ اب بڑی بے کیفی کے ساتھ کھانا کھانے میں مصروف ہوئی۔

اس وقت صرف ایک اور کنبہ وہاں موجود تھا۔ لڑکی نے اکتا کر ان پر نظر ڈالی، بیوی کے سر میں تیل۔ کسا ہوا جوڑا بھدی چھینٹ کی نائیلون کی ساڑھی، سونے کی چوڑیاں، مانگ میں سیندور، ماتھے پر پلاسٹک کی نیلی بندی۔ بچے بازار کے سلے ہوئے "بابا سوٹ" پہنے شوہر کے ہاتھ میں "دھرم یگ" کا تازہ پرچہ، وہ سب بھی ایک دوسرے سے بے زار بیٹھے تھے۔

بیرے نے کھانا سرو کیا۔ وہ رام پور کا تھا اور شکل سے احمد جان تھرکوا کا بھائی معلوم ہوتا تھا، زندگی بڑی بے رنگ، مضمحل، خجالت آمیز اور بے ہودہ شے تھی۔ کھانے کے بعد وہ پلیٹ لے کر وہ بدھو کو کھلانے کے لئے باہر آئی۔ پھر وہ ٹہلتی ہوئی دریا کی طرف چلی گئی۔ راستے میں وہ پلاسٹک کی بندی

والی بیوی ملیں۔ انہوں نے اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھا، وہ مسکرائی وہ بھی مجبوراً مسکرائیں۔ لڑکی ان سے باتیں کرنے لگی۔

انہوں نے پوچھا، "کون ذات ہو؟"

"برہمن" اس نے جواب دیا۔

"بن دیوی" اس نے کہا۔

"وہ تمہارے ہز بینڈ نہیں ہیں؟"

"اور آپ کو کیا لگتے ہیں؟" لڑکی نے ہنس کر پوچھا وہ تیوری پر بل ڈال کر آگے بڑھ گئیں۔

وہ کمپاؤنڈ سے نکل کر اس جگہ پہنچی جہاں ایک نئی عمارت تعمیر کرنے والوں کے خیمے لگے ہوئے تھے، اس وقت وہ جنگل کے کنارے باجماعت نماز ظہر ادا کرنے میں مشغول تھے۔ انگیٹھیوں پر مرغن کھانے پک رہے تھے۔ ایک آدمی نے سلام پھیر کر اس پر نظر ڈالی اور دریافت کیا۔

"جی میم صاحب۔ فرمائیے؟"

"کچھ نہیں، ایسے ہی چلی آئی تھی۔ کیا پک رہا ہے؟"

"بسم اللہ کیجئے! ارے دلاور، ذرا میم صاحب کے لئے زردہ تو نکال کر لانا۔" اس نے کرسی پیش کی "ہم لوگ بجنور کے رہنے والے ہیں، سال بھر سے اس جنگل میں پڑے ہیں، کام ختم ہو تو واپس جائیں۔"

نیاز کی تاب میں سے مت دینا" ایک نورانی صورت والے سفید ریش نے آہستہ سے لڑکے سے کہا، لڑکی نے سن لیا۔

دلاور پھول دار تام چینی کی پلیٹ میں زردہ نکال لایا لڑکی نے مسکرا کر پوچھا۔

"کس کی نیاز تھی؟"

"بڈھے پیر کی" لڑکے نے ذرا جھینپ کر جواب دیا۔

لڑکی نے زردہ چکھا اور ایک بیس روپے کا نوٹ دلاور کو بھی تھما دیا۔

"آداب عرض میم صاحب" ٹھیکیدار نے شائستگی سے کہا۔

"وعلیکم السلام" اس نے جواب دیا اور کمپاؤنڈ کی طرف واپس چلی گئی۔ بجوریوں نے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

تیسری صبح، گیارہ بجے۔ بریگیڈیئر دھوپ میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ آدمی تیز تیز چلتا اس کے پاس آیا اور بولا " میں ایک ضروری کام سے شہر جا رہا ہوں۔ رات کو آؤں گا یا کل صبح۔ آپ اور مسز فری مینٹل ذرا میری بیوی کا خیال رکھئے گا" اور اپنی جیپ اسٹیشن ویگن میں بیٹھ کر پھاٹک سے باہر چلا گیا۔

مسز فری مینٹل نے کہا" بدتمیز آدمی ایسی پھول سی لڑکی کو مارتا ہے۔ مجھے یقین ہے اس بیچاری کے غریب ماں باپ نے روپے کی خاطر اس کے ہاتھ بیچ دیا ہوگا۔ مشرق میں یہ عام طور پر ہوتا رہا ہے۔"

"۔۔ آکر کرسی کے برابر کھڑا ہو گیا۔ مسز فری مینٹل نے پیار سے اس کی تھوتھنی پر ہاتھ پھیرا، وہ ایک جنگلی سور تھا جو جنگل سے نمودار ہوتا تھا اور اپنی خاطریں کرا کے جنگل میں واپس چلا جاتا تھا۔ حاطے والوں نے اس کا نام بدھو رکھ چھوڑا تھا۔ لڑکی ریسٹ ہاؤس سے نکل کر باہر آئی گڈ مارننگ۔

کہہ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"بوڈو جنگل کا بہترین پبلک ریلیشنز آفیسر ہے، وہاں کا نمائندہ جو انسانوں کے جنگل سے رابطہ رکھتا ہے" بریگیڈیر نے کہا۔

"وہ جنگل اندر سے نہ جانے کیسا ہوگا" لڑکی بولی۔

"تم اسے اندر سے دیکھ تو چکی ہو"۔

بالکل، بے حد اندر سے نہیں دیکھا"

اس کے اندر بسے والوں کے لئے وہ ایسا ہی ہوگا جیسے ہمارے لئے بھری دنیا۔ جب ہم اور جاپانی برما کے جنگلوں میں لڑ رہے تھے تو دونوں درندے لگتے تھے"۔

پچھلے ایک دو دن میں اس ملنسار لڑکی سے دونوں میاں بیوی کی دوستی ہو گئی تھی۔

مسز فری مینٹل کارواں کی طرف چلی گئی۔

"کیا میں لنچ تک آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟" لڑکی نے بریگیڈیر سے پوچھا۔

یقیناً، تمہارا شوہر بھی ہم سے کہہ گیا ہے کہ"

وہ ہنس پڑی "وہ میرا شوہر نہیں ہے، میں اس سے کلکتہ ریس کورس پر ملی تھی۔ وہ ایک مالدار جوکی ہے، بیوی بچوں والا اور پورٹ، میں چھ مہینے سے اس کے ساتھ ہوں، مگر اب بور ہو چکی ہوں اور اسے چھوڑنا چاہتی ہوں۔ مگر وہ مجھے چھوڑنے کو تیار نہیں۔ میں اس سے اتنا مال بٹور چکی ہوں جتنا سال بھر میں نہیں کما سکتی تھی، یہ ہیرے دیکھئے۔ بلیو بیلجیم"

"آئی سی" بریگیڈیر کے منہ سے نکلا۔ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا تھا" مگر میری بیوی کے

سامنے یہ سب نہ کہنا، وہ قدامت پرست انگریز خاتون ہے۔ پھر وہ تم سے بات نہ کریں گی۔

"ویری ویل بریگیڈیر"

مگر تم ایک شریف خاندان کی معلوم ہوتی ہو تم"

"کیا آپ بھی وہی بات دہرانے والے ہیں کہ تم جیسی شریف لڑکی یہ کیا کر رہی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے جناب کہ THERE IS BIG MONEY IN IT اور اب ہماری بزنس انٹرنیشنل بنتی جا رہی ہے۔ میری چند سہیلیاں مڈل ایسٹ اور مغرب کے چکر لگاتی ہیں۔ میرے والدین اور بھائی کو میرے متعلق معلوم ہے وہ دلی میں ہیں"

وہ خوفناک آدمی جو تمہارے ساتھ آیا تھا وہ کون ہے۔ بریگیڈیر نے دریافت کیا۔

"میرا پبلک ریلیشنز آفیسر"

بریگیڈیر نے نرمی سے کہا "مائی ڈیر۔ کیا تم کو ڈر نہیں لگتا؟ کبھی تم کسی ایسے آدمی کے ہاتھ لگ جاؤ جو نیم مجنوں ہو یا سادیت پسند یا.... کیونکہ پاگل پن اور صحیح الدماغی میں بال برابر کا فرق ہے۔

"یہ آدمی بھی SADIST ہے مگر میں اسے ہینڈل کرنا جانتی ہوں اور بہر حال یہ OCCUPATIONAL HAZARDS تو ہیں ہی۔ میری ایک سہیلی جو اسکول میں میرے ساتھ پڑھتی تھی نرس بن کر ولیسٹ جرمنی گئی۔ نرسنگ چھوڑ کر وہ ہمبرگ کے ایروس پیلیس میں شامل ہو گئی۔ بس پھر چند روز میں لکھ پتی، شاندار گھر ہوسٹنگ پول، بڑھیا کار، موقع ملا تو میں بھی باہر جا کر یہی کام کروں گی۔

"کیا کام مائی ڈیئر؟" مسز فری مینٹل نے اپنی کارواں کار سے واپس آتے ہوئے دریافت کیا۔

"سوشل ورک" خدمت خلق مسز فری مینٹل" لڑکی نے متانت سے جواب دیا۔

"پنچ" بریگیڈیر نے زیرلب کہا۔

کچھ دیر بعد وہ لنچ کے لئے چلی گئی۔ تیسرے پہر کو برآمدے میں نکلی، ایک زخمی پرندہ جو پر پھڑپھڑاتا برآمدے میں منڈلا رہا تھا، ایک در سے ٹکرا کر نیچے گرا۔ لڑکی نے اسے اٹھایا اور بڑے رنج اور دردمندی سے اُسے پچکارتی رہی۔ پھر اسے کچھ خیال آیا، پرند کو ساری کے آنچل میں چھپا کر کیمبرج والوں کے خیموں کی طرف روانہ ہوگئی۔

ایک چھولداری کے سامنے وہ پانچوں بیٹھے تھے۔ تین لڑکے، دو لڑکیاں، صحت مند، لمبے تڑنگے سنہری بالوں، سنہری ڈاڑھی والے نوجوان، یورپ کے شمالی جنگلوں کے دیوتا، سورج کی اولاد اور لڑکیاں گوری، چٹی، سنہری، تر و تازہ، بن دیویاں، کیا شاندار لوگ ہیں یہ یورپین، ایک ہم ہیں سڑے بُسے کالے کلوٹے، سوکھے، مُرخ، ناٹے، بدشکل لاغر، ٹڈے، جھینگر، اس نے سوچا اور اشتیاق سے ان کو تکتی رہی۔ پھر ذرا جھجک کر آگے بڑھی وہ پانچوں تبادلہ خیالات میں منہمک تھے ان کے علوم کی کتابیں قریب رکھی تھیں۔

"گڈ مارننگ" اس نے کہا۔ "ایکسیوز می۔"

"ہلو۔ گڈ مارننگ" ایک سورج کا بیٹا اُٹھ کر اس کی طرف آیا۔

اس نے زخمی چڑیا پیش کی "مجھے خیال آیا آپ لوگ جنگل کے مطالعے کے لئے آئے ہیں۔ آپ کو دلچسپی ہوگی۔"

"اوہ ہاؤ ویری نائس آف یو۔ تھینکس" لڑکے نے پرندہ بڑی احتیاط سے ہاتھ میں لیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف لپکا، وہ لوگ فوراً پرندے کی مرہم پٹی میں مصروف ہوگئے۔

چند منٹ تک وہ اس امید میں کھڑی رہی کہ وہ اس سے بات کریں گے۔ پھر مایوس ہو کر واپس لوٹ گئی۔

شام کے وقت وہ برآمدے میں اکتائی ہوئی کھڑی تھی، جب وہی انگریز لڑکا بار کی سمت جاتا نظر آیا وہ فوراً اندر گئی اور بار روم کے صوفے پر ٹک گئی۔ لڑکا بیئر کی بوتلیں خرید کر دروازے کی طرف بڑھا۔ لڑکی نے ہاتھ اٹھا کر "ہلو" کہا۔ وہ سر خم کر کے مسکرایا اور اس کے نزدیک آیا۔

"گڈ ایوننگ میم مسز۔۔۔"

"مسز ایل"

"ہاؤ آر یو مسز ایل؟"

"میرا اپنا نام رم ہے۔"

"آپ مذاق تو نہیں کر رہی ہیں؟ رم اور رایل!"

"بالکل نہیں، میں اپنے شوہر کو ALEE پکارتی ہوں، وہ اسی نام سے مشہور ہو گیا ہے، میرا اپنا نام دراصل رمبھا ہے جو ہماری ہندو مائیتھولوجی میں ایک رقاصہ تھی۔"

"کس قدر دل چسپ" لڑکے نے کہا "میرا نام محض برنارڈ کریگ ہے۔"

بیٹھو۔ کافی پیو۔ میرا! لڑکی نے آواز دی۔ وہ یک لخت بہت خوش اور پُر امید نظر آ رہی تھی۔

"تمہارا پرندہ اب کیسا ہے؟"

مرہم پٹی کے بعد اب وہ اچھا ہو گیا۔ اپنے جنگل واپس چلا گیا؟" انگریز نوجوان نے جواب دیا اور بیٹھ کر رسمی گفتگو کرنے لگا۔

"میں سوچتی ہوں، ہم بھی اپنے جنگل واپس جائیں، یعنی مہذب دنیا میں، یہاں وقت گزارنا بہت مشکل ہے وقت یہاں ساکن ہے لیکن کیپٹن کا ارادہ ہے کہ چند روز اور قیام کر کے مہاشیر پکڑیں پہاڑوں کے نیچے جہاں سے رام گنگا نکلتی ہے۔"

"ہم لوگ بھی وہ جگہیں دیکھنے آئے تھے جہاں سے دریا نکلتے ہیں۔"

سورج دیوتا نے کہا، سنہرے بالوں کا ہاں، سنہری داڑھی بار روم کی نیم تاریکی میں سورج کی طرح روشن وہ اسے دیکھتی رہی۔ وہ کہہ رہا تھا "مجھے ہندوستان اتنا اچھا لگا کہ دل چاہتا ہے کہ ہندوستانی لڑکی سے شادی بھی کرلوں۔ میرے انگریز دوست جنہوں نے ہندوستانی لڑکیوں سے شادیاں کی ہیں بہت خوش ہیں۔ وہ کہتے ہیں آپ لوگ بے حد وفا شعار اور خدمت گزار بیویاں ثابت ہوتی ہیں۔ ہماری لڑکیوں سے بالکل مختلف۔"

لڑکی کا چہرہ سُرخ ہوگیا، وہ بے حد مضطرب نظر آئی۔ بیرا قہوے کی ٹرے لے کر آگیا۔ وہ کافی بنانے میں معروف ہوگئی۔ پھر اس نے پوچھا "تم نے یہاں شیر دیکھا؟"

"نہیں۔ پرسوں یہاں گارا باندھا گیا تھا۔ ہم لوگ بہت دیر تک مچان پر بیٹھے رہے، مگر شیر نہیں آیا، اب پرسوں ترسوں ہم لوگ دہلی چلے جائیں گے۔ پھر واپس انگلینڈ۔"

لڑکی نے آہستہ آہستہ اُداس آواز میں کہنا شروع کیا "میرے والد ہز ہائی نس آف کرن پور اپنے زمانے کے نامور شکاری تھے ان کے ساتھ میں بہت سی شکارگاہوں پر گئی ہوں، میرا بھائی بھی ماہر شکاری ہے۔"

انگریزی نوجوان بڑے اشتیاق سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کہتی رہی "جب رجواڑے

ٹوٹنے تو میں بہت چھوٹی تھی۔ ہمارا طرزِ زندگی بدل گیا۔ بڑی ہو کر مجھے ائر ہوسٹس بننا پڑا"۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر انگوٹھی دکھائی "یہ بلیو بلجیم ہمارے آبائی خزانے کی آخری یادگار ہے"۔

"نیسی نیٹنگ اچنانچہ تم فلائنگ پرنسس تھیں"۔

"پرواز کے دوران طیارے کے کیپٹن سے دوستی ہو گئی۔ ہم نے شادی کر لی، وہ شراب بہت پینے لگا تھا۔ اس لئے اسے گراؤنڈ کر دیا گیا۔ اب میں اپنے ناقابلِ برداشت شرابی شوہر سے طلاق لینے والی ہوں۔ کاش ....."

انگریز نوجوان خاموش رہا۔

"یہ جگہ فطرت کا حصہ ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان سچ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اس وجہ سے میں تم کو یہ سب بتا رہی ہوں"۔

"میری عزت افزائی ہے مسز ایلی" برنارڈ کریگ نے نرمی سے کہا۔

ایک آدمی بھاری سیاہ اوور کوٹ پہنے ہوئے کمرے میں داخل ہوا، برنارڈ نے اس پر نظر ڈالی اور بولا "مسز ایلی آپ نے کبھی غور کیا۔ بعض انسانوں کی صورتیں اور حلیے جانوروں سے ملتے جلتے ہیں؟ کیا یہ آدمی ہمالیہ کا سیاہ ریچھ نہیں ہے؟ اور کل ہم نے ایک پستہ قد شخص دیکھا وہ بالکل SLOTH BEAR معلوم ہوتا تھا۔

"اور میں کسی حیوان سے مشابہ ہوں؟" لڑکی نے مسکرا کر دریافت کیا۔

برطانوی نوجوان نے اسے دھیان سے دیکھا۔ اور بولا "چیتل یا جنگلی بلی"۔

"شکریہ" کیونکہ میری آنکھیں شربتی ہیں؟ ہاں انسانوں اور جانوروں کی آنکھیں ایک جیسی

ہوتی ہیں ۔ بجو کی منحوس آنکھ، مچھلی کی سرد آنکھ، بیل کی احمقانہ آنکھ۔"

وہ دیکھیے ایک پہاڑی بکرا اسٹول پر جا بیٹھا۔"

لڑکے نے ہنس کر کہا۔

وہ بھی ہنس پڑی "کچھ لوگ مینڈک معلوم ہوتے ہیں، کچھ ہاتھی، کچھ گینڈے، کچھ ٹڈے اور بیل اور سارس، بعض عورتیں چھپکلی معلوم ہوتی ہیں، یا بے وقوف چڑیاں۔"

یہ سارا ایک خاندان ہے۔" برنارڈ نے جواب دیا۔ میرا ایک ہندو دوست کہتا ہے کہ سب جاندار ایک کنبہ ہیں اور سب آواگون کے قانون کے مطابق اسی ہزار جونیں بدلتے رہتے ہیں۔

" اچھا" لڑکی نے تعجب سے پوچھا۔

" آپ ہندو نہیں ہیں !"

" نہیں ۔ میں ۔ میں عیسائی ہوں۔ میری ممی ہز ہائی نس آف کرن پور عیسائی تھیں۔"

" اوہ !" برنارڈ نے نظر بھر کر اسے دیکھا، کافی ختم کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔" کافی کا شکریہ۔ شب بخیر پرنسس کل ملاقات ہوگی۔"

وہ ذرا تیزی سے باہر جا کر کمرے میں غائب ہو گیا۔

چوتھی صبح برطانوی طلبا ایک درخت کے نیچے مصروف مطالعہ تھے۔ لڑکی ٹہلتی ہوئی ان کے قریب سے گزری، انہوں نے اُسے نہیں دیکھا" میں ہندوستانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، میں ہندوستانی لڑکی سے ....." وہ تیز تیز چلتی ہوئی گنجوریوں کی خیمہ گاہ تک پہنچی۔ نورانی صورت والے بڑے میاں مصلے پر بیٹھے تھے۔

"السلام علیکم" اس نے قریب جا کر کہا۔

"وعلیکم السلام" بڑے میاں نے ذرا مشتبہ نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ آہستہ سے ملتجیانہ آواز میں بولی "حضور میرے لئے دعا کیجئے ۔میرے لئے دعائے خیر کیجئے۔ نیاز مانئے، میری زندگی سنور جائے، بڑے پیر کی منت مانئے، کچھ کیجئے۔ جلدی جلدی ۔یہ لیجئے۔" اس نے پرس سے دو سو کے نوٹ نکال کے سامنے رکھے اور الٹے پاؤں واپس ہو گئی۔ بڑے میاں بھونچکے ہو کر اسے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

شام۔ ٹاٹا آدمی واپس آچکا تھا۔ اور برآمدے میں کھڑا جیپ اسٹیشن ویگن میں مچھلی کے شکار کا سامان رکھوا رہا تھا۔ اس نے ایک بیرے کو حکم دیا۔

"میم صاحب کو بولو، جلدی کریں۔"

بیرے نے اوپر جا کر دروازے پر دستک دی۔ لڑکی نے اودے رنگ کا ٹراؤزر سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور آئینے کے سامنے کھڑی میک اپ کر رہی تھی۔

دروازہ کھول کر اس نے کہا۔ صاحب کو بولو ابھی آتے ہیں۔" پھر وہ پچھلے زینے سے اُتر کر کیمبرج والوں کے کیمپ کی طرف بھاگی۔

برنارڈ برگد تلے پتھر پر بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ "گڈ ایوننگ مسز ایل!" اس نے چونک کر کہا۔

"دم — !" لڑکی نے مسکرا کر جواب دیا۔

وہ خاموش رہا۔ وہ ایک شادی شدہ عورت سے دوستی بڑھا کر کسی مصیبت میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔

"میں مسز ایل نہیں ہوں"، لڑکی نے انتہائی مضطرب ہو کر کہا "مجھے اپنا دلی کا پتہ دیتے جاؤ۔ میں اس گورکھ دھندے سے نکلنا چاہتی ہوں۔ میں برطانیہ آنا چاہتی ہوں، کیا تم میری مدد کرو گے؟"

"بڑے تعجب کی بات ہے، جو ہندوستانی مجھ سے ملتا ہے یہی درخواست کرتا ہے کہ وہ برطانیہ آنا چاہتا ہے۔" برنارڈ نے ترشی سے جواب دیا۔

"میں تم کو پوری بات بتاؤں گی، پوری بات، مجھے اپنا دلی کا پتہ دے دو۔"

"ابھی ہم لوگوں نے طے نہیں کیا ہے کہ وہ کہاں ٹھہریں گے۔"

جیپ قریب آکر رکی۔ ناٹے آدمی نے دروازہ کھولا اور سرد آواز میں کہا "چلو!"

اس نے گھبرا کر برنارڈ پر نظر ڈالی اور جیپ میں بیٹھ گئی۔ پھاٹک میں پہنچ کر جیپ ریت میں پھنس گئی۔ بریگیڈیئر فری مینٹل ٹہلتے ہوئے آرہے تھے۔ انہوں نے چند آدمیوں کو بلایا۔ سب نے مل کر گاڑی کو دھکا دیا۔ وہ پھاٹک سے نکلی، لڑکی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بریگیڈیئر نے رومال سے چندیا اور چہرہ صاف کرکے "خدا حافظ" کہنے کے لئے ہاتھ ہلایا، دور کیمبرج والوں کی خیمہ گاہ میں روشنیاں جل رہی تھیں۔

جنگل کے راستے میں گھپ اندھیرا تھا۔ وہ ڈر کر ناٹے آدمی سے لپٹ گئی "بڑی خوفناک جگہ ہے۔ واپس چلو۔"

"کل تمہارا وہ میز شکار بھائی آرہا ہے۔ کیا اسے اسی لئے بلایا ہے۔ دیکھتا ہوں کیسے جاتی ہو!" اس نے دل میں کہا۔ اس کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ اکیلی جاؤں گی۔ عین اس وقت مولوی صاحب وظیفہ پڑھ رہے ہوں گے۔ مسز برنارڈ کرنگ میں بہت وفا شعار، خدمت گزار ہندوستانی

بیوی ثابت ہوں گی۔ ورنہ جرمنی کا ایرو س پلیس ، بڑی گدھیا ہے۔ کن چھدرے آدمی کی آواز۔ وہ بندوق سنبھالے مچان پر بیٹھا۔ نیچے وہ چارے کی طرح بندھی ہوئی تھی۔ پھر بجنوری مولوی کا نورانی چہرہ اس چہرے کا تصور کر کے اچانک وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا اور بشاش و محفوظ محسوس کرنے لگی۔ اس نے کہا۔ وہ گیت تو سناؤ۔ دل جنگل ہی میں۔۔۔"

گویا کسی نے ریکارڈ پر سوئی رکھ دی۔ آدمی نے فوراً الاپنا شروع کیا۔ دل جنگل ہی میں بہتا ہے۔ یہاں پریم کا ساغر چلتا ہے۔ پردیسی پریت کہاں جائیں۔ ہم ایسا گیت کہاں جائیں۔ کھل جائے جس سے دل کی کلی۔ یہاں دلوں کی کلی کبھی نہ۔۔۔۔" آدمی نے گاڑی ساحل پر روک دی وہ کود کر ریت پر اتری۔ فشنگ کا سامان اتارنے میں آدمی کی مدد کی۔

رام گنگا پگھلی چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ آدمی نے ہپ فلاسک نکال کر شراب کا ایک گھونٹ بھرا۔

یہاں تو اور بھی زیادہ سردی ہے۔ لڑکی نے لرز کر کہا۔

دسمبر کی رات میں دریا کے کنارے کیا گرمی ہو گی؟" آدمی نے جواب دیا۔" دوڑ لگاؤ، سردی بھاگ جائے گی۔"

وہ ریت پر دوڑنے لگی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے دلکی چلتا رہا۔ پھر ہانپنے لگا۔ اچانک لڑکی نے کہا۔" کیا خوبصورت جگہ ہے۔" اس نے کافی کا فلاسک کندھے سے اتارا اور ریت پر بیٹھ گئی۔

سامنے دریا کے دوسرے کنارے پر شوالک کی ایک پہاڑی سنگی دیوار کی طرح ایستادہ تھی۔ دیوار پر ایک آبی غار کا عکس لرزاں تھا اور وہ جگہ جل پریوں کا محل معلوم ہو رہی تھی۔

آدمی بھدسے اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ اس نے ہپ فلاسک منہ کو لگایا اور ترنگ میں آکر کہنے لگا۔ لب جو ہو، فرشِ آب ہو، شب ماہ ہو، بادہ ناب ہو، میرے پاس بیٹھا ہو وہ صنم، لئے اپنے ہاتھ میں جام جم، جام جم، جام جم ۔ اے لوف آف بریڈ۔ اے جگ ان وائن ۔ لو پیو۔"

"نہیں، میں کافی پیوں گی۔" پھر اس نے دل میں کہا۔ میرے لئے مولوی صاحب اس وقت وظیفہ پڑھ رہے ہوں گے۔ میں شراب کیسے پی سکتی ہوں۔

آدمی بڑبڑاتا رہا ۔ میرے پاس بیٹھا ہے وہ پاجی صنم، حرامی، بدمعاش صنم۔" وہ سارا فلاسک غٹ غٹ پی گیا۔ اب وہ ایسا چوہا معلوم ہو رہا تھا جسے بیسہ پلا دیا گیا ہو۔ وہ آنکھیں بند کر کے سر جھکائے بیٹھ گیا۔

لڑکی بڑبڑائی ۔" اتنے جاڑے میں بھلا کوئی مچھلی پکڑتا ہے۔ رات کے وقت؟ واپس چلو، ورنہ میں نمونیہ سے مرجاؤں گی۔"

وہ اتنا غفیل رہا۔

"میں جا کر گاڑی میں بیٹھتی ہوں۔"

وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

"بن مانس!"

اس نے سر نہ اٹھایا۔

"بجو۔"

وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔

"جھینگر! مینی ماسٹر!"

وہ چپکا رہا۔

"بڈھا ٹڈا!"

معاً وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور لڑکی کو ایک لات رسید کی اور وہ پھسل کر پانی میں جا گری۔

"بچاؤ!" وہ چلائی ۔ پانی کے ریلے نے اسے آگے دھکیل دیا۔ مقابل کے آبی غار کے اوپر پانی کے عکس میں تلاطم پیدا ہوا۔ ایک گھڑیال اپنی ماقبل تاریخ، ارضیاتی وقت کی نیند سے چونک کر کاہلی کے ساتھ چٹان پر سے سرکا اور پانی میں اُتر کر ڈوبتی ہوئی لڑکی کی طرف بڑھا۔

ہاتھ پاؤں مارتی لڑکی پانی سے اُبھری۔ اُسے نظر آیا۔ سرد چاندنی میں چمکتا پانی اس کے چاروں طرف تھا اور ایک سیاہ گھڑیال منہ کھولے اس کی طرف آ رہا تھا۔

گھڑیال نے لڑکی کی ٹانگیں اپنے جبڑوں میں دبوچ لیں۔ لڑکی نے ایک فلک شگاف چیخ بلند کی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ گھڑیال کے منہ کے اندر پہنچتے ہی وہ دہشت سے مر چکی تھی۔

گھڑیال اسے منہ میں لیے لیے آبی کھوہ کی جانب بڑھا۔ پہاڑی کی ننگی دیوار کے نیچے چٹان پر پہنچ کر ذرا سستایا اس وقت وہ لاکھوں برس قبل کے وقت میں موجود تھا اور ہمالیہ کے یہ دریا اسی طرح برف سے نکل رہے تھے اور یہ پہاڑ اور جنگل اور چٹانیں اسی طرح موجود تھیں۔ گھڑیال نے لڑکی کو چبا چبا کر نگلنا شروع کیا۔ دریا کی سطح پر خون کے چند بھنور سے ابھرے، بالوں کے گچھے، گوشت اور کپڑوں کے ٹکڑے پانی پر تیرنے لگے۔ گھڑیال بڑی طمانیت سے ڈنر کھا رہا تھا۔

ناٹے آدمی نے ساحل پر سے دیکھا۔ اس کے جسم کے رونگٹے اور سر کے بال کھڑے ہو گئے۔

اس کی SLOTH BEAR جیسی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گیئں۔ وہ ہڑبڑا کر جیپ کی جانب دوڑا جو ندد ساحل کے کنارے ایک قدیم درخت کے نزدیک کھڑی تھی۔ اس گھنے درخت کے تنے میں جسے دیمک چاٹ گئی تھی سانپ کے بل تھے۔ آدمی کی آہٹ پر پتے سرسرائے ایک اژدہا بل سے نکلا۔ ایک ہرنی جاگ اٹھی۔ کپکپاتے ہوئے آدمی نے مڑ کر دیکھا۔ رام گنگا شانت تھی اور پگھلی چاندی کی طرح بہہ رہی تھی۔ آدمی نے انجن اسٹارٹ کیا۔ اس کی گڑگڑاہٹ سناٹے میں بہت ہیبت ناک معلوم ہوئی۔ اندھا دھند جیپ دوڑاتا وہ جنگل کی سڑک پر واپس آیا۔ ہیڈلائٹس کے سامنے اچانک ایک لکڑبگا آگیا اور دور سے ہنسا۔

رات گزری، چاند ڈوبا۔ سورج رام گنگا پر طلوع ہوا۔ جنگل جاگا۔ بریک فاسٹ کے وقت بدھو جنگل سے نکل کر کمپاؤنڈ میں آیا۔ ریسٹ ہاؤس کے برآمدے کے نیچے پہنچا اور لڑکی کے انتظار میں سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ جو روز اسے ناشتہ کراتی تھی۔

❊

جن بولو ـ تارا ـ تارا

دلارے چچا جیسے لوگ کردار داقدار کے بحران اور افراطِ زر کی پیدا کردہ اخلاقی لستی کے موجودہ دور میں کم یاب ہیں۔ پہلے بالخصوص قصبات اور دیہات میں اکثر پائے جاتے تھے۔ نیک سرشت بے ضرر، رونقِ محفل، کم نصیب اور ناکارہ۔ دلارے چچا کا تعلق روہیل کھنڈ کمایوں ریلوے سے ہرگز نہ تھا۔ لیکن ہمیشہ چھوٹی لائن والے کہلائے کہ اتر پردیش کے تعصباتی فیوڈل کنبوں میں اگر کوئی من چلے صاحبزادے کسی مغنیہ، ڈومنی، خانہ زاد ملازمہ، قحط زدہ کسان لڑکی یا کسی "نیچ ذات" عورت سے نکاح کر لیتے تھے یا اسے "گھر ڈال" لیتے تھے تو اس کی اولاد اکثر چھوٹی لائن" کہلاتی تھی۔ وہ اپنے باپ کے خاندان سے ہم سری کا دعویٰ نہ کر سکتی تھی۔ بلکہ ان کے حاشیہ برداروں کی حیثیت سے زلیست کرتی تھی۔ احساس کم تری اور افلاس میں مبتلا ان لڑکیوں کی شادیاں بھی خاندان میں نہ ہو سکتی تھیں۔

دلارے چچا ہمارے ایک قرابت دار گھرانے کے "چھوٹی لائن" تھے۔ لیکن اس لحاظ سے خوش قسمت کہ ان کی ماں (جو ایک پردہ نشین شریف میراثن تھیں۔ ان کے والد کی واحد منکوحہ بیوی تھیں۔ لہٰذا دلارے چچا اُن کے اکلوتے لڑکے اور باپ کی املاک کے تنہا وارث۔ برادری اور قصبے میں مقبول۔ فن گفتگو کے ماہر۔ جگت چچا۔ ساری بستی کے دکھ درد میں کام آنا ان کا مشغلہ تھا۔ شادی، غمی، ہر موقع کے انتظامات ان کے سپرد کئے جاتے (ان کی اپنی شادی کا الگ قصہ ہے۔ جو آئے گا) لا ولد تھے اور بچوں کے شیدائی۔ ان کا مکان بستی کے کنارے پر واقع تھا۔ جس کے بعد سرسبز و شاداب کھیت اور باغات انبہ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ جب کبھی ہم لوگ وطن جاتے۔ گرمیوں میں دلارے چچا اپنے آم کے باغ میں (جہاں وہ سیزن میں ایک مرتبہ ساری برادری کی دعوت کرتے تھے) یا سردیوں میں چبوترے پر حوالی موالیوں کے ساتھ بیٹھے گپیں مانگتے بیچوان گڑگڑاتے پائے جاتے۔ دعوتیں کرنے کے علاوہ ان کے دو شوق اور تھے۔ شکار اور سینما۔ ہر نئی انگریزی اور ہندوستانی فلم اپنی فورڈ موٹر کار پر مصاحبوں کے ساتھ شہر یا دلی جاکر ملاحظہ کرتے۔ خاموش فلموں کو یاد کرتے جو بالکل STONE AGE کا تذکرہ معلوم ہوتا۔" صاحب ۲۶ء میں ہمانسو رائے نے۔ شیراز جرمنوں کے ساتھ مل کر بنائی تھی۔ اور "لائٹ آف ایشیا" میں مہاتما بدھ خود بنے تھے۔ ایک اینگلو انڈین لڑکی رینی اسمتھ کا نام سنیتا دیوی رکھا تھا۔ وہ اس کی ہیروئن تھی۔ یہ فلم لندن میں چار مہینے چلی تھی۔ بادشاہ سلامت نے بھی اسے دیکھا تھا۔ جناب والا۔ "کرما" بھی لندن میں بنی۔ دیویکا رانی نے بالکل میموں کی طرح انگریزی میں گانا تھا۔ کرما، کرما — یہ ۳۳ء کی بات ہے۔

واقعہ یہ تھا کہ یہ وائیلٹ کوپر، ارملین ۔ بیبتیا دیوی ۔ آزوری ۔ زیب النسا۔ کجن، زبیدہ، سلطانہ، نادیا الوری، مادھوری، سلوچنا بڑی ناقابل یقین سی ہستیاں معلوم ہوتیں ۔ بالوں کے گچھے بنائے۔ طویل بندے گلوبند اور عجیب و غریب ساڑیاں جن پر ریشمی فیتوں کے سلمہ ٹکے ہوئے تھے۔ اور عجیب بلاؤز پہنے ان بے حد حسین خواتین کے پس منظران سے زیادہ پراسرار تھے ۔ کلکتہ اور بمبئی کے اینگلو انڈین اور یہودی محلے تھیئٹر کمپنیاں، لاہور کا شاہی محلہ وغیرہ۔ متعدد براھمی اور بنگالی مڈل کلاس تعلیم یافتہ عورتیں بھی فلم انڈسٹری میں موجود تھیں۔ مگر جو رومانس اور اسرار ارملین اور عشرت سلطانہ، ببو، مس معصر تھا وہ لیلا چٹنس بی اے اور سادھنا بوس، میں ہرگز نہ تھا۔

بہر کیف ان خواتین یا ان کی فلموں کا تذکرہ کرنے والے ہمارے ہاں فرد واحد دلارے چچا تھے اور ان کی اس موضوع پر گفتگو اتفاقیہ ہی بچوں کے کانوں میں پڑتی تھی۔ کیونکہ سینما ایک قطعی مخرب الاخلاق شے سمجھی جاتی تھی۔ ذاتی طور پر سینما سے دلارے چچا کا ایک مخصوص رابطہ ان کی ڈھکی رگ تھی اور ایک ممنوع موضوع گفتگو۔ علاوہ ازیں خود ہمارے ہاں کے نوجوانوں کو سینما سے کوئی خاص دل چسپی نہ رہی ۔ دراصل اس وقت تک یہ فلم انڈسٹری کی اتنی ترقی ہوئی تھی نہ ماس میڈیا کی جس کے ذریعے سینما ساری قوم کے ہوش و حواس پر حاوی ہو سکے۔ جیسا وہ آج ہے۔ مختصر یہ کہ فلم اسٹاروں کا چرچا، فلمی پریس، فلمی موسیقی ۔ ابھی لوگوں کا اوڑھنا بچھونا نہ بنے تھے ۔ لہذا دلارے چچا کی سینما سے اتنی وابستگی ایک انوکھی اور افسوسناک بات تصور کی جاتی تھی۔ ہمارے ایک نوعمر کزن نے دلارے چچا کی رہبری میں، مس اشوک کمار سے ان کی دستخط شدہ تصویر منگوائی تو لے سے بڑے اہتمام اور

احتیاط سے ایک کمرے کے دروازے بند کرکے ہمیں دکھایا تھا۔ اس شرط پر کہ "امی جان سے ہرگز نہ کہنا۔"

لڑکیوں کو سینما دیکھنے کی اجازت ہی نہ تھی۔ انگریزی پکچر جانا البتہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً یوں کہ کل ہم نے A TALE OF TWO CITIES دیکھی۔ میں تو خیر یہ ناول بھی پڑھ چکی ہوں۔" چھوٹی کو لال اینڈ ہارڈی کی فلم اور والٹ ڈزنی "اسنو وائٹ" وغیرہ دکھلائے جاتے تھے۔

ایک مرتبہ میری والدہ کے پاس ان کی ایک پنجابی سہیلی کپور تھلہ سے خط آیا تھا جس میں انہوں نے اپنے شوہر کے متعلق مختصراً اطلاع دی تھی۔ "نجم فلم میں کام کرتا ہے۔" تو والدہ کو بہت رنج ہوا تھا۔ کرنل اصغر علی کا داماد ایکٹر بن گیا۔ افسوس!"

بمبئی ٹاکیز کے ہیرو نجم الحسن کو اس مختصر جملے کے ساتھ ہماری امی جان نے تو DISMISS کر دیا مگر دلارے چچا پوری جانکاری رکھتے تھے۔

ارے صاحب، نجم الحسن کی کیا بات تھی۔ بس دو ہی تو خوب صورت ہیرو آئے تھے۔ ایک گل حمید مرحوم ایک یہ نجم الحسن۔ وہ گاتا خوب تھا۔ ان کی فلم، انا تھ آشرم، کا۔ سرکار یہ غلام روٹی کھانے جاتا ہے۔ بازار سے یہ حلوہ پوری لانے جاتا ہے۔"

دلارے چچا کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔ امی کبھی کبھی اپنے ایک عزیز کے بارے میں تاسف سے کہتیں: "امتیاز بھی فلمیں بنا رہا ہے۔" سید امتیاز علی تاج نے ایک فلم "سہاگ کا دن" لاہور میں بنائی تھی۔ ان کا یہ ڈرامہ "نیرنگ خیال" میں چھپا تھا، دلارے چچا نے فوراً اس کا ایک

مکالمہ دہرایا: مہارانی تمہارے سہاگ پر مرتیو کی چھایا کانپ رہی ہے۔"

امتیاز علی تاج آج کل کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اشکپوئیل ڈائرکٹروں کے پیش رو تھے۔ اور ان کے ساتھی پطرس بخاری اور ڈرامہ نویس رفیع پیر اور حکیم احمد شجاع اور لاہور اور کلکتہ کے دوسرے دانش وروں نے سینما کے میڈیم میں دل چسپی لینی شروع کر دی تھی۔ حکیم یوسف حسن کا "نیرنگِ خیال" غالباً اردو کا پہلا ادبی رسالہ تھا جس نے اردو فلموں کے بارے میں مضامین اور تصاویر شائع کیں۔ لیکن ہمارے آبائی قصبے میں اس دل چسپی کی وجہ سے بے چارے والا سے چچا کو عجوبۂ روزگار سمجھا جاتا تھا۔

سال نامۂ نیرنگِ خیال ۱۹۲۹ء جس میں میں نے حال ہی میں دیکھا۔ جس میں پطرس بخاری کا باتصویر مضمون "انگلستان کا جدید ترین تھیٹر" اور دیوان آتما نند شرر ملتانی کا مضمون چارلی چیلین پر شامل ہے۔ (دیوان شرر نے اس کے دو تین سال بعد پہلی انگریزی فلم "کرما" میں بھی کام کیا) اسی سالنامے میں ایک اشتہار موجود ہے: "بستان — اردو زبان میں سینما کے متعلق پہلا باتصویر رسالہ۔ سینما کے ایکٹروں، ایکٹرسوں کے اندرونی حالات۔ فلموں کے متعلق تازہ ترین معلومات مشہور ایکٹروں اور مشہود مناظر کی تصویریں غرض جو کچھ آپ رات کو سینما کے پردے پر دیکھتے ہیں۔ یہاں آپ کو روزِ روشن میں بے پردہ نظر آئے گا۔ پنجاب کے نامور شاعر ڈراما آرٹسٹ اور فلم آرٹسٹ دیوان آتم نند شرر بی اے ایم اے ایس (لندن) اس کے اڈیٹر ہوں گے۔ اس رسالہ کا نوروز نمبر (پہلا پرچہ) کرسمس کے دن ۲۵ دسمبر کو شائع ہو جائے گا۔ دارالاشاعت پنجاب، ریلوے روڈ، لاہور"

یہ رسالہ بھی سید امتیاز علی تاج ہی شائع کر رہے تھے۔ دارالاشاعت پنجاب، لاہور ان کے

والد شمس العلما مولوی سید ممتاز علی کا مشہور و معروف اشاعتی ادارہ تھا۔ "نیرنگِ خیال" سال نامہ ۱۹۳۵ء میں جہاں آرا کجن، نلنی ترکھد، زیب النسار زبیدہ سلطانہ، سردار اختر، مختار بیگم وغیرہ کی تصاویر مع تعارفی نوٹ۔ ممتاز بیگم، انگلیوں میں سگریٹ تھامے۔ عورتوں کی سگریٹ نوشی ہمارے ہاں آج بے حد معیوب سمجھی جاتی ہے کیونکہ سگریٹ محض ارباب نشاط پیتی تھیں۔ لاہور میں بھی فلمیں بن رہی تھیں۔ جو بے حد رومینٹک بات معلوم ہوتی تھی۔

ایک اور پرانا رسالہ۔ آرٹ پیپر پر۔ نیو تھیٹرز کا ماہ نامہ "عکاس" اڈیٹر غالبؔ آرزو لکھنوی نیو تھیٹرز نے فلموں کو اچانک نہایت باعزت بنا دیا تھا۔

دلارے چچا قصبے میں اپنی بیٹھک کے اندر پیچوان کے کش لگاتے نیو تھیٹرز، پربھات، بمبئی ٹاکیز اور مزدا کے کارناموں پر روشنی ڈالتے۔ سینما کی پبلسٹی کا طریقہ سرکس والوں جیسا تھا۔ ایک ٹھیلے پر فلم کے پوسٹر، ساتھ ساتھ ایک دو بینڈ بجانے والے۔۔۔ ایک چھوکرا باتصویر پمفلٹ بانٹتا تھا۔ یہ پمفلٹ دلارے چچا اولین بولتی فلموں کے وقت سے جمع کر رہے تھے۔ "زین کا چاند"، "بمبئی کی بلی"، "اندرا ایم اے"، "رنگیلا راجہ"، "لعلِ یمن"، "طوفان میل"، "امر جیوتی"، "دہان"، "جیون پربھات"، "وطن"، "نرملا"، "طلاق"، "خان بہادر"، "جیلر"، "پکار"

نسیم بانو اب دلارے چچا کی پسندیدہ ایکٹرس تھیں۔ کلکتہ کے رسالے "اورینٹ" میں ایک تصویر چھپی تھی کہ نسیم بانو ز کانوں میں بجلیاں، کلائیوں میں بے شمار چوڑیاں، بغیر آستین کا بلاؤز، گلاب کا پھول ملاحظہ کر رہی ہیں۔ یہ رسالہ دلارے چچا کی بیٹھک کی وسطی میز پر رکھا رہتا تھا۔ دلارے چچا نے فوراً بتایا۔ "دہلی کی کوئین میری گرلز ہائی سکول میں پڑھتی تھی۔ فراک پہن کر اپنی موٹر کار

پر اسکول جاتی تھی۔

اس قسم کی معلومات آپ کو صرف دلارے چچا سے حاصل ہو سکتی تھیں۔

ایک روز جب دلارے چچا اپنے مصاحبوں کے ساتھ سہراب مودی کی فلموں پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔ میں بھی کھیلتی کودتی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ فوراً بولے" بی بی، جایئے۔ کوٹھی پر واپس جایئے۔ بھابی صاحب سے عرض کیجئے۔ دلارے چچا شام کو قدم بوسی کے لئے حاضر ہو گا۔"

دلارے چچا مجھے وہاں سے بھگانا چاہ رہے تھے۔ مگر پری چہرہ نسیم سے ذرا قبل وہ اس گلدار کا قصہ چھیڑ چکے تھے۔ جو انہوں نے گزشتہ ماہ لال ڈانگ کے جنگل میں مارا تھا۔ جو میں پورا سننا چاہتی تھی۔ جب میں گھر واپس پہنچی (ہم لوگ کرسمس کی چھٹیوں میں قصبے آئے ہوئے تھے) تو والد نے پوچھا" کہاں ماری ماری پھر رہی ہو ادائی توائی؟

" دلارے چچا — " میں نے مختصراً جواب دیا۔"

دلارے چچا نگوڑا پھر بیٹھ گیا ہو گا ایکٹرسوں کے شجرے سنانے" ایک پھوپھی نے اظہار خیال کیا۔ مصاحب خاموش ہو گئے۔

سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دلارے چچا جیسے پیارے انسان کا تذکرہ ہمارے بزرگوں کو ملول کیوں کر دیتا تھا۔

دوسرے روز جب میں دلارے چچا کے گھر ان کے خرگوش اور ہرن کے بچے دیکھنے گئی۔ (جو انہوں نے باغ میں پال رکھے تھے) تو وہ آرام کرسی پر بیٹھے بڑے انہماک سے لاہور کے ایک

فلمی پرچے "چترا ویکلی" میں سوال وجواب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ "سوال: نسیم بانو کی لڑکی کا کیا نام ہے؟ جواب: افسوس کہ نسیم بانو نے اپنی لڑکی کے نام کرن سنسکار پر ہمیں نہیں بلایا تھا۔" مجھے آرام کرسی کے پیچھے سے جھانکتا پاکر بولے " جائیے، باغ میں جاکر کھیلئے۔ یہ رسالہ آپ کے پڑھنے کا نہیں ہے۔"

دلارے چچا کے بارہ دروازوں والے طویل دالان کی دیوار پر ایکٹرسوں کی رنگین تصاویر ایک قطار میں آویزاں تھیں۔ مہتاب، گوہر، پدما دیوی، زبیدہ، بَبّو، مس روز، رمولا وغیرہ۔ وغیرہ ان میں سے چند کی ساریوں پر ابرق لگی تھی اور شام کو جب دالان کے جھاڑ فانوس روشن کئے جاتے تو وہ تصویریں جگمگا اُٹھتیں۔

اس قطار میں ایک جگہ خالی تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس جگہ پر لگی ہوئی تصویر کو اتار دیا ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا، وہ جگہ خالی ہی دیکھی تھی۔ مگر بزرگوں نے ہم سب بچوں کو سمجھا رکھا تھا کہ دلارے چچا سے کبھی اس خالی جگہ کے متعلق دریافت نہ کریں کہ وہاں کس کا فوٹوگراف آویزاں تھا۔

دلارے چچا کی زندگی کا وہ ایک ایسا الم ناک گوشہ تھا جس کی پردہ داری مارے وضع داری کے سب مل کر کرتے تھے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا۔ نجیب الطرفین نہ ہونے کے کارن ان کا بیاہ خاندان یا برادری میں نہ ہو سکتا تھا۔ جوانی میں وہ خاصے طرح دار رہے ہوں گے۔ مگر عیاش یا آوارہ بالکل نہیں تھے۔ سینما کا بے حد معصوم سا شوق رکھتے تھے۔ ایک بار دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے

بھوپال کی طرف گئے۔ وہاں سے بمبئی پہنچے۔ وہاں ایک دن ان کے میزبان ان کو ریس کورس
پر لے گئے۔ ریس کورس پر ان کو ایک ایکٹریس ملی، جو ان پر ریجھ گئی۔ وہ خاص مشہور اور بے حد
حسین اور گل اندام اداکارہ تھی اور غالباً شاہی محلہ، لاہور سے تعلق رکھتی تھی اور کسی شریف آدمی
سے نکاح کرکے شریفانہ گرہستی گزارنے کی ازحد متمنی تھی۔ دلارے چچا کی نیک دلی اور بھولپن
پہلی ملاقات میں ہی لوگوں پر ظاہر ہو جاتا تھا۔ وہ لڑکی ان پر بالکل عاشق ہو گئی۔ دلارے چچا
"بڑی لائن" کے چشم و چراغ ہوتے تو ایک فلم ایکٹریس سے بیاہ کرنے کی ہمت نہ کر سکتے، لیکن
محض اس وجہ سے کہ ان کی ماں میراثن تھیں۔ ان کو پہلے ہی "ٹاٹ باہر" سمجھا جاتا تھا۔ لہذا
انہوں نے خاموشی کے ساتھ اس اداکارہ سے عقد کر لیا اور برقع اڑھا کر اسے وطن لے آئے۔

حسب توقع ان کے خاندان اور برادری کی بیگمات نے ان کی بیوی سے پردہ کیا۔ دلارے
چچا اسے لے گرمیاں گزارنے مسوری گئے۔ واپسی پر ہمارے ہاں دہرہ دون آئے۔

راقم الحروف کی والدہ کے متعلق غالباً انہوں نے سوچا ہوگا کہ اتنی روشن خیال اور مصلح
قوم خاتون ان کی منکوحہ کو ضرور شرفِ باریابی بخشیں گی۔ میں اس صبح ایک سور اوک کے تنے
پر گلہریوں کی آمد و رفت ملاحظہ کر رہی تھی کہ ایک تانگہ وارد ہوا۔ دلارے چچا چاٹا ٹانگ پر ٹانگ
رکھے رئیسانہ انداز سے براجمان۔ برابر سنہرے ریشمی برقع میں ملفوف ایک خاتون۔ تانگہ برساتی
میں پہنچا۔ میں پیچھے پیچھے دوڑی۔ دلارے چچا نے کہا "بی بی، جا کر بھابی صاحب سے عرض
کیجئے دلارے آیا ہے۔ دلارے اور اس کی اہلیہ قدم بوسی کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔" میں نے
تیر کی طرح اندر جا کر اماں سے کہا۔ وہ اپنے دور کی مشہور ادیبہ اور سوشل ریفارمر تھیں۔ ستار

بجاتی تھیں اور کار چلاتی تھیں۔ لیکن ایکٹرسوں سے ملنے کی وہ بھی روادار نہ تھیں۔ بیزاری کے ساتھ جواب دیا۔" کہہ دو، میرا بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے ملنے جلنے کو منع کر دیا ہے"

میں نے باہر جا کر پیغام دہرایا۔ دلارے چچا تانگہ سے اُتر کر برآمدے کے نیچے ٹہل رہے تھے۔ میری بات سن کر ان کا چہرہ اُتر گیا۔ یقیناً اُن کو میری والدہ سے اس رویے کی اُمید نہ تھی انتہائی مایوس آواز میں بولے " بہت خوب! ہم دونوں کی طرف سے مزاج پرسی کر دینا اور تسلیم عرض کرنا۔" پھر وہ واپس جا کر سیٹ پر بیٹھ گئے۔ برقع پوش خاتون نے اب تک نقاب نہ اُلٹی تھی۔ وہ اسی طرح چہرہ چھپائے تانگے سے اُتریں۔ برقع میں سے ہاتھ نکال کر ولایتی گڑیا کا بڑا ساڈبہ انہوں نے برآمدے کے فرش پر سرکا دیا۔ شاید سوچا ہو کہ ان کے "ناپاک" ہاتھوں سے میں گڑیا بھی نہ لوں گی۔ اس کے بعد وہ تانگے پر سوار ہوئیں اور تانگہ برساتی سے باہر نکل گیا۔

اس زمانے میں فلمی پریس، فلمی گوسپ کالم، فلم رپورٹر، یہ سب آج جیسا تھا ہی نہیں۔ فلمی اداکاروں کے اسکینڈل، معاشقے، طلاقیں، شادیاں آج کی طرح قومی اہمیت کے مسائل اور خبریں نہ بنتی تھیں۔ فلم اسٹارز کی معاشرہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ لہٰذا اس بے چاری ایکٹرس کی دلارے چچا سے شادی کا بالکل چرچا نہ ہوا۔ حالاں کہ وہ "گل بکاؤلی" اور "حاتم طائی" وغیرہ قسم کی فلموں کی کافی مقبول ہیروئن تھی۔

مسوری سے واپس جا کر دلارے چچا شاید اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ اس کو اپنے قصبے والی حویلی میں نہ اتار، سیدھے اپنے علاقے پر لے گئے۔ جہاں ان کا دیہاتی مکان خالی پڑا تھا اس کے بعد سے دلارے چچا ہفتے میں دو تین دن کے لئے قصبے والے مکان پر آتے پھر گاؤں چلے جاتے۔

جہاں ان کی بیوی ان کی خدمت گزاری ۔ نماز روزے اور خانہ داری میں معروف سات پردوں میں مستور رہیں ۔ اور صرف تین سال بعد لبعادصنہ یرقان راہی ملک عدم ہوئیں ۔ سنا ہے مرتے وقت بہت خوش اور احسان مند تھیں کہ ایک باعزت گرہستن کی حیثیت سے دنیا سے جارہی تھیں ۔ سنا ہے ان کی یہ بات سن کر دلارے چچا پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔

ان کے چہلم کے بعد اداس اور دل شکستہ دلارے چچا قصبے واپس آ کر رفتہ رفتہ پھر اپنے مشاغل میں لگ گئے ۔ ان کے دیوان خانے کے اس "پکچر گیلری" میں ملا کماری ، رتن بائی ۔ مایا بنرجی وغیرہ کی قطار میں دراصل اسی اداکارہ کی تصویر موجود تھی ، جو اسے بیاہ لانے کے بعد فوراً اتار کر دلارے چچا نے تلف کر دی تھی ۔ تب سے اس فوٹو گراف کی جگہ خالی پڑی تھی ۔ اور اب تو وہ حسینہ دنیا ہی میں اپنی جگہ خالی کر گئی تھی ۔

دلارے چچا کی اس ذاتی ٹریجڈی کا تذکرہ بالکل نہیں کیا جاتا تھا ۔ کیوں کہ سب کو معلوم تھا کہ وہ بہت ہی نیک اور اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی اور دلارے چچا ان سے بہت محبت کرنے لگے تھے ۔ انہوں نے دوبارہ شادی نہ کی ۔

آہستہ آہستہ سارے ملک کے سماجی رویوں میں تبدیلی آتی جارہی تھی ۔ علی گڑھ گرلز کالج کے بانی شیخ محمد عبداللہ کی صاحب زادی خورشید جہاں مرزا ، "رینو کا دیوی" بن کر اچانک تہلکہ مچا چکی تھیں ۔ ان کی بھاوج شاہدہ آپا "پراسرار نینا" کے روپ میں پردہ سیمیں پر آئیں تو لوگوں کو اتنا ذہنی دھکا نہ لگا ۔ اس وقت تک ہندوستان میں دوسری جنگِ عظیم کافی سماجی انقلاب لا چکی تھی ۔

دلارے چچا اپنے دیوان خانے یا آم کے باغ میں فروکش چندر موہن کی "بھروسہ"۔ جمنا کی "زندگی" محبوب کی "عورت" نسیم بانو کی "میں ہاری" پر روشنی ڈالا کئے۔ "میں ہاری" میں جب وہ کہتا ہے: "یہ جو تم کوئلوں کو دھونا چاہتی ہو۔ اور وہ گانا گھٹ پہ اگ چھیل چھبیلی پنیا بھرن کو آئی۔ کیا فلم تھی صاحب!"

ایک نوعمر ایکٹرس کی دھوم مچی جو اپنے اسٹائل اور انداز سے ایک نہایت شائستہ اور انگریزی وضع کی اسکول گرل معلوم ہوتی تھی۔ اپنی ہم عمر ایکٹرسوں سے بہت مختلف، احباب نے تفصیلات کے لئے فوراً دلارے چچا سے رجوع کیا۔ فرمایا "حضت، اپنے منجھلے میاں ہیں نا! ان کے تایا ابا کو تو آپ جانتے ہیں کتنے بڑے صاحب نظر ہیں اور موسیقاروں کے سرپرست، ان کے دو ماہر فن مصاحب تھے۔ دونو سید زادے، دونوں ماہر ستار نواز۔ تو صاحب اس بچی کی ماں بھی آپ جانتے ہیں کتنی بڑی گائیکہ ہیں۔ اپنی ذاتی فلم کمپنی بھی رکھتی ہیں۔ تو وہ منجھلے میاں کے تایا ابا کے یہاں مجرے کے لئے بلائی جاتی تھیں۔ وہ ان دونوں کو اپنے ساتھ کلکتہ لے گئیں۔ مشہور میوزک ڈائرکٹر بنے۔"

سامعین دلارے چچا کی انسائیکلو پیڈیائی معلومات پر عش عش کرتے۔

لیکن مینا کماری کے دور تک پہنچتے پہنچتے دلارے چچا کی دل چسپی سینما میں مدھم پڑ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ زمیں داری کے خاتمے کے بعد دلارے چچا شدید مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔ ساری زندگی بےفکری اور خوش حالی میں گزاری تھی۔ بیشتر مسلمان رؤسا اور زمینداروں کی طرح کھانے کھلانے میں خوب روپیہ اڑایا تھا۔ دسترخوان پر صبح و شام دس

دس احباب اور مصاحبین ان کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ اب اچانک ان کو افلاس اور تنہائی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے "بڑی لاتن" والے سارے رشتہ دار کراچی سدھارے۔ قصبے کا نقشہ بدل گیا۔ ایک وقت تھا کہ دلارے چچا کے دیوان خانے میں بھانت بھانت کے دلچسپ لوگوں کا جمگھٹا رہتا۔ محلے کے ایک بزرگ ہر لحاظ سے صحیح الدماغ تھے۔ محض ایک خبط لاحق تھا کہ شہزادی ایلزبتھ سے بیاہ کریں گے۔ بڑی سنجیدگی سے فرماتے۔ بکنگھم پیلس میں بادشاہ سلامت نے میرے لئے کمرے ٹھیک کرا دیئے ہیں، مگر میں تو اسے رخصت کرا کے یہیں لاؤں گا۔ اور پردے میں رکھوں گا۔ دلارے چچا نہایت متانت اور دردمندی کے ساتھ ان بزرگ کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے۔ ایک شکستہ حال، اکبر خمیدہ مغل شہزادے، جو لبتی میں مطلب کرتے تھے، اپنے مطب سے ہر دوسرے تیسرے روز اٹھ کر دلارے چچا کے پاس آتے اور ان کو وہ اپنے کرم خوردہ شجرے دکھاتے جن کی بنیاد پر وہ دلارے چچا کی مدد سے گورنمنٹ آف انڈیا اور برٹش گورنمنٹ پر قلعۂ آگرہ کی ملکیت کا دعویٰ دائر کرنے والے تھے۔

ایک اور صاحب کا ارشاد تھا کہ عالم برزخ میں ریڈیو سٹیشن کھل گیا ہے۔ آدھی رات کے بعد وہ ریڈیو سیٹ پر مختلف آں جہانی مشاہیرِ عالم کی تقاریر پر اور سنگیت کاروں کے پروگرام وغیرہ سنا کرتے ہیں۔ مثلاً یہ "کل رات ہی بسمارک اپنی تقریر میں کہہ رہا تھا" یا "پرسوں رات جانکی بائی نے پھر اپنی وہ غزل سنائی تھی۔ ایک کافر یہ طبیعت آگئی ہے۔"

دلارے چچا بڑے صبر کے ساتھ ان بزرگ کی بڑ سنا کرتے۔ بعد میں کہتے: "میاں! یہ بیچارے اللہ کے بندے جانے کس کس کے ستائے ہوئے ہیں۔ کن دکھوں کے مارے ہیں۔ اب اپنے ان

تصورات میں مگن ہیں. کیوں اختلاف رائے کر کے ان لوگوں کا دل توڑو؟" طرزِ تپاک اہل دنیا نے خود دلارے چچا کا دل بہت جلایا تھا. مگر وہ ہمیشہ مسکرایا کیے۔

حال میں مدت مدید کے بعد دلارے چچا سے ملاقات ہوئی۔ اپنی اُجاڑ بیٹھک میں اسی آرام کرسی پر نیم دراز پیچوان پر کش لگا رہے تھے۔ عمر پچھتر برس کے قریب ہو چکی تھی۔ بوڑھے کمزور اور تنہا۔ میں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ چھت خالی پڑی تھی۔ جھاڑ فانوس کب بکے تھے۔ فرش پر سے قالین غائب۔ دیوار پر پرانی ایکٹرسوں کی تصاویر البتہ موجود تھیں اور بالکل زمانہ قبل از مسیح کی یادگاریں معلوم ہو رہی تھیں۔ لیلا ڈیلیطی دیویکا رانی اور سلطانہ کی تصاویر کے پیچھے چڑیوں نے گھونسلے بنالیے تھے۔ ویرانی اور اُداسی در و دیوار سے ٹپک رہی تھی۔

میں نے سوچا، دلارے چچا کو ان کے محبوب تذکروں سے ذرا چیر اپ CHEER UP کرنا چاہیئے۔ سلطانہ کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے انہیں مخاطب کیا؛ دلارے چچا ـــ سلطانہ سے کراچی میں ملاقات ہوئی۔ ایک انڈسٹریلیٹ رزاق باؤلا نے ان سے شادی کر لی ہے۔"

"ہاں بی بی" چچا سنبھل کر بیٹھ گئے۔" سلطانہ اتنی حسین تھی کہ اس کے کئی پرستاروں نے اس کے عشق میں خودکشی کر لی تھی ـ اور یہ رزاق باؤلا جو ہیں۔ ان کے بڑے بھائی کو بمبئی میں ایک مہاراجہ نے قتل کرا دیا تھا۔ باؤلا مرڈر کیس۔ ممتاز بیگم کے چکر میں۔ ممتاز بیگم ہالی وڈ چلی گئی۔

اس زمانے میں بھی لوگ ہالی وڈ چلے جاتے تھے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

کیوں؟ کیا محض تمہارا زمانہ ہی سب کچھ ہے؟ پچھلا زمانہ کچھ نہیں تھا؟" وہ ذرا ملول ہو

کر پھر پہچان کی طرف متوجہ ہوئے۔

میں نے تصاویر کی نچلی قطار پر نگاہ دوڑائی گل حمید، راجہ سینڈو۔ ای بلی موریہ۔ ماسٹر وتھل، نذیر، موتی لال، ماسٹر نثار۔

میں نے پھر بات شروع کی۔ چند سال ہوئے بمبئی میں ایک شادی کی تقریب میں قوالوں کی پچھلی صف میں بیٹھا ایک مخنی، شکستہ حال آدمی نحیف آواز میں گا رہا تھا۔ کسی نے بتایا کہ وہ ماسٹر نثار تھے۔"

افسوس۔ وہ شخص جب ہم بمبئی گئے تھے، اپنی رولز رائس رکھتا تھا" دلارے چچا نے سرد آہ بھری۔

مجھے خیال آیا کہ یہ تو میں ان کو چیر اپ کرنے کی بجائے اور بھی رنجیدہ کر رہی ہوں۔ لہذا میں نے بشاشت سے کہا "دلارے چچا معلوم ہے۔ ان دنوں بولتی فلموں کی گولڈن جوبلی منائی جا رہی ہے۔"

"اچھا ــ؟" انہوں نے چونک کر پوچھا "پچاس سال! کل کی تو بات ہے کہ میں اور جنو میاں "عالم آرا" دیکھنے دہلی گئے تھے۔

دلارے چچا مزید دل گرفتہ نظر آئے۔ میں ان کے لئے انگریزی اور اردو کے تازہ فلمی رسالے ساتھ لیتی گئی تھی۔ پیش کئے۔

"بی بی موتیا بند کی وجہ سے صاف سجھائی نا دیتا۔ برسوں سے کوئی پکچر نہیں دیکھی۔ یہاں اسی قصبے میں بڑے بڑے سینما ہال کھل گئے۔ گھر گھر ٹیلی وژن لگ گیا۔ ہمارے لئے سب بیکار۔

اور سنو، ہماری اس بستی میں ایسی ایسی حرکتیں لوگ کر رہے ہیں جو پہلے کبھی نہ ہوئیں۔ ایک صاحب ہیں۔ وہ نیپال کے راستے غیر قانونی کاروبار میں معروف ہیں، ان کے نودولتیے لڑکوں نے ہمارے پڑوس میں نیا مکان بنایا ہے۔ ایک کمرہ پچاس ساٹھ ہزار روپیہ خرچ کر کے سجایا ہے۔ اسے 'ڈسکو روم' بولتے ہیں۔ اس میں رات بھر شور مچتا ہے۔ بھیانک آوازوں کے ریکارڈ بجاتے ہیں۔ رات بھر ہمیں نیند نہیں آتی۔ اُدھر جھیل پار ایک خان صاحب اپنے ٹیلی وژن پر اپنی مرضی کے سینما چلا کر دیکھا کرتے ہیں۔ سب کی سب ایک سی اسٹنٹ پکچریں۔ مار دھاڑ سے بھرپور۔" دلارے چچا کی آواز پر بے زاری اور تکان کا غلبہ تھا۔

میں نے انگریزی کا ایک فلم میگزین ان کے سامنے رکھا اور پھر انہیں بشاش کرنے کی سعی کی "دلارے چچا، کوئی ایکٹرس نسرین تھی؟"

"ہاں — ہاں، تھی۔ کیوں" دلارے چچا چونک کر متوجہ ہوئے۔

"یہ ایک اور پاکستانی لڑکی لندن سے بمبئی آئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اس کی ماں نے شاہ جہاں، فلم میں کام کیا تھا۔"

دلارے چچا نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ آنکھوں میں پرانی چمک سی آگئی۔ اپنے سابقہ جانکاری والے انداز سے سر ہلا کر بولے "سمجھ گئے۔ ایک انور بائی آف امرتسر ہوا کرتی تھی۔ بڑی حسین مہ جبین۔ ریڈیو والے جنگل کشور رہرہ نے اسلام قبول کر کے اس سے نکاح کر لیا تھا۔ شیخ احمد سلمان اپنا نام رکھا تھا۔ پاکستان چلے گئے تھے۔ انور بائی کی لڑکی تھی، نسرین، شاہ جہاں، فلم کی ہیروئن۔"

چند لمحوں کے لئے پرانے دلارے چچا واپس آگئے تھے۔ لیکن فوراً ہی رسالہ ہاتھ سے رکھ کر

انہوں نے اونگھنا شروع کر دیا۔

مجھے یاد آیا، شیخ احمد سلمان ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان، سید امتیاز علی تاج اور ان کے بڑے بھائی سید حمید علی کے گہرے دوست تھے۔ لاہور سے کراچی آکر حمید بھائی ان کے ہاں قیام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نسرین نے میری والدہ کو فون کر کے پوچھا کہ سید حمید کب تک آرہے ہیں اور اپنا تعارف کرایا تھا کہ وہ شیخ احمد سلمان کی بیٹی ہیں۔ (اس طرح کی قطعی غیر ضروری باتیں میرے دماغ میں خوب محفوظ رہتی ہیں۔ مثلاً یہی: نسرین کا اماں کو فون کرنا، جو اس وقت دلارے چچا کی بات پر مجھے فوراً یاد آگیا۔) میں نے کہا "جی ہاں۔ دلارے چچا۔ شاید۔"

لیکن دلارے چچا پر غنودگی طاری ہو چکی تھی۔ میں اُٹھ کر طویل ڈھنڈار دالان میں ٹہلنے لگی۔ سارا فرنیچر فروخت کیا جا چکا تھا۔ ایک گوشے میں دقیانوسی گراموفون اور ریکارڈ البتہ ابھی موجود تھے۔ غالباً اس لئے کہ انہیں کون خریدتا؟"

میں نے وہ قدیم ریکارڈ الٹے پلٹے۔ سردار منصور۔ انیس خاتون آف کان پور۔ راج کماری دلاری ملکہ پکھراج۔ زہرہ بائی انبالہ والی۔ ایک ریکارڈ مختار بیگم کا نکلا: "جن بولو تارا تارا۔" مجھے فی الفور ایک اور بات یاد آئی۔ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب کے چھوٹے بھائی فلم ڈائرکٹر بن گئے تھے۔ ایک پکچر "کاروانِ حسن" ڈائریکٹ کی تھی۔ اس کی ہیروئن سے شادی کر لی تھی۔ بچپن میں جب میں پروفیسر صاحب کی سالی کے ساتھ کھیلنے ان کے ہاں جاتی تو وہ سابق ہیروئن تارا پیشانی تک دوپٹے سے سر ڈھانپے تخت پر بیٹھی نماز پڑھتی نظر آتیں۔ پیاری سی شکل تھی۔ میری مجو لی نے یہ بھی بتایا تھا کہ مختار بیگم کا مشہور گیت "جن بولو تارا تارا" ان ہی کے لئے کمپوز کیا گیا تھا۔ میں نے پلٹ

کر آواز دی۔ دلارے چچا، یہ فریدہ خانم، مختار بیگم کی بہن ہے یا بیٹی؟

لیکن دلارے چچا بڑھاپے کی پریشان نیند میں ڈوب چکے تھے۔ ایک پرندہ کملیش کماری کی تصویر کے نیچے سے پھڑپھڑاتا نکلا۔ میں نے اس کے برابر والی جگہ پر نظر ڈالی۔ آج تک دلارے چچا سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی تھی کہ ان کی گمنام، نادیدہ، پردہ نشین اہلیہ خاموش اور اولین ٹاکی پکچروں کی کونسی "فلمی پری"، تھیں، جن کی رنگین تصویر دلارے چچا نے ان سے عقد کرنے کے بعد اس امید پر اس دیوار پر سے اتار دی تھی کہ شاید معاشرے میں ان کو جگہ مل جائے۔ اور تعجب کی بات ہے کہ خاندان اور برادری کے کسی فرد نے بھی اس بے چاری کا نام یاد رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ لہٰذا ہم نے اس کا نام ہی نہ سنا تھا۔ یا اگر سنا ہوگا تو اب یاد نہیں۔

میں نے مختار بیگم کا ریکارڈ لگایا۔ گھسی ہوئی آواز نکلی: "جن بولو تارا تارا۔ جن بولو تارا تارا۔ جن بولو تارا تارا۔"

دلارے چچا مضمحل سے خراٹے لے رہے تھے۔ میں شکستہ گراموفون بند کرکے ان کے ویران دیوان خانے سے باہر آگئی۔

پس نوشت: چند روز قبل قصبے سے ایک عزیز کا خط آیا ہے کہ دلارے چچا اس جہان سے گزر گئے۔ گاؤں میں اپنی گمنام اہلیہ کے نزدیک سپردِ خاک کئے گئے۔ دوسری جانب ان کی ماں کی قبر ہے۔ ان مرحومہ کو بھی معاشرے نے قبول نہیں کیا تھا۔

قصبے میں دلارے چچا کا مکان ان کی "بڑی لالٹن" کے ایک رشتہ دار کو مل گیا۔ دیوان خانے کی تمام تصاویر نکال کر پھینک دی گئیں۔ اب اس میں ایک سیاسی پارٹی کا دفتر کھل گیا ہے۔

❊

اگلے جنم موہے بِٹیا نہ کیجو

"لگا کے کاجل چلے گوسائیں" بھورے قوال کی فلک شگاف تان سے چراغ کی لَو بھی تھرا گئی۔
ارے لگا کے کاجل چلے گسئیاں۔ بھورے خاں کے دس سالہ صاحبزادے شدّ و مدّ سے اپنی باریک آواز میں نغمہ سرا ہوئے۔

اے ہے لگا کے کاجل چلے گسئیاں۔ چاروں فاقہ زدہ ساتھی تالیاں بجا بجا کر دہرانے لگے۔ بھورے خان ہارمونیم پر سر نہوڑائے تیز تیز انگلیاں چلایا کیے۔ پھر سر اٹھا کر اوپر روشن آسمان کو دیکھا۔ جس پر بارہویں شب کا چاند جگمگا رہا تھا۔ آسمان صحرائے شام کا وہ سیاہ پوش راہب ہے جو اپنی خانقاہ کی محراب میں قندیل جلائے رکھتا ہے لیکن مسافروں کو راستہ نہیں ملتا۔

چلے گوسائیں۔ چلے۔

شب معراج کا بیان اور بھورے خاں کا لاثانی فن۔ ہنڈے شاہ کا بارونق عرس۔ سامعین

سے کر مبہوت بیٹھے تھے۔ ایک آدمی قوال پارٹی کے سامنے دھری تیل کی ڈبیا کی لو اکسانے میں منہمک ہو گیا۔ کیونکہ درگاہ میں آویزاں گیس کا ہنڈا مدھم پڑ چکا تھا۔ اسی زنگ آلود پیٹرومیکس کی وجہ سے وہ بزرگ ہنڈے شاہ کہلاتے تھے۔ وہ اپنے معتقدین کے مانند ایک مسکین، غیر معروف بزرگ تھے۔ جانتے تھے بھی کہ نہیں۔ یہ سب جو ہو رہا ہے۔ ہے یا نہیں۔ یا اس کی اصل اور بنیاد کیا ہے۔ ہنڈے شاہ غیر موجود ہیں تو موجود کیا ہے اور جو کچھ ہے بس یہی ہے تو غیر موجود کیا ہے۔ اور جو ہے اس کا جواز بھی کوئی بتلائے۔ مزید برآں فنکاروں اور ادیبوں، شاعروں کی طرح اولیاء بھی اس لحاظ سے بعضے خوش نصیب ہوتے ہیں کہ ان کو دنیا جانتی ہے۔ بعضوں کو چند اللہ کے بندے ہی چراغ جلانے کے لئے میسر آتے ہیں۔ بعضوں کو وہ بھی نہیں۔

پیر ہنڈے شاہ کے غریبانہ عرس میں آنے والے تیلی، جولاہے، کنجڑے۔ قصائی، بھڑبھونجے کاشت کار، مزدور، جھونپڑوں میں زندگیاں گزار کر کچی قبروں میں دفن ہوئے۔ خدا کے مقبول بندے وہی ہیں۔ جیسے وہ بوڑھی شریفن۔ بیوہ لاوارث، مفلس، ان پڑھ، جو درگاہ کے پیچھے چبوترے پر نمازِ عشاء پڑھ رہی ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ اکبر۔ پڑھتی ہوں کلمہ اللہ محمدؐ کا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اللہ اکبر۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ قیام، رکوع سجدہ، قعدہ۔ قیام۔ رکوع۔ سجدہ۔ قعدہ۔ اس عورت نے جسے نماز پڑھنا نہیں آتی ساری عمر جب بھی کمر توڑ محنت مزدوری سے مہلت پائی اپنے رب کو اسی طرح یاد کیا۔ اس کی اکلوتی جوان، معصوم مظلوم لڑکی کو اس کے سسرال والوں نے گنڈاسے سے ہلاک کر دیا تھا اور پولیس کو کھلا پلا کر مزے سے دندناتے ہیں۔ شریفن گھر گھر جا کر چکی پیستی ہے۔ اور چار آنے روز کماتی ہے۔ سب سے پہلے جنت میں وہی

جلئے گی۔

اور یہ گمنام، بے بضاعت دیہاتی قوال اور یہ ان کے سامعین۔ غیر اہم۔ حقیر، عسرت زدہ۔ صابر و شاکر۔ اور عرس کے میلے کے یہ دکاندار۔ کچی داڑھیوں والے تہمد پوش۔ میلے دوپٹوں، چاندی کی بالیوں اور پیوند لگے، گھٹنوں والی جوان اور بوڑھی عورتیں جو اپنے سامنے ٹاٹ بچھائے بیٹھی ہیں اور ان پر تھوڑی سی کھجوریں، چنے، موم پھلی کی ذرا ذرا سی ڈھیریاں، ریوڑھی، بتاشے، اندرسے، گڑ کی بھیلیاں دھری ہیں اور ایک ایک ٹین کی ڈبیا ٹمٹما رہی ہے۔ یقین جانو۔ اور ایمان لے آؤ۔ کہ اہل بہشت یہی لوگ ہیں۔

ایک سپید ریش بڈھے میاں "ہر مال ملے گا چار آنے" کی صدا لگا رہے ہیں۔ ان کی دکان فیتوں میں ٹنکے بندے، کلپ، ہاروں اور نقلی گھڑیوں پر مشتمل ہے میلے والیاں ہیں کہ اس ڈیپارٹمنٹ اسٹور پر ٹوٹی پڑ رہی ہیں۔

"یہ کلپ کیا بھاؤ دیا۔" ایک نوعمر لڑکی جارجٹ کا بوسیدہ سبز دوپٹہ سر سے لپیٹ کر اکڑوں بیٹھ جاتی ہے۔

"ہر مال ملے گا چار آنے۔ بیٹیا۔"

لڑکی دوپٹے کے کونے کی گرہ کھول کر چونی نکالتی ہے۔ پھر ایک ہار کو للچائی نظروں سے دیکھتی ہے۔ اس میں فقط چار آنے باقی ہیں ابھی جمیلن کے لئے کچھ خریدنا ہے۔

"اچھا ایک کلپ اور دیدو۔ وہ لال والا۔ ہماری چھوٹی بہن کے لئے۔" لڑکی نے زرد "کیلے" کی قمیص اور نیلی ساٹن کی شلوار پہن رکھی ہے۔ کلائیوں میں ہری "ریشمیں" چوڑیاں۔

"ڈسنک قمر۔ او ڈسنک قمر۔" بھیڑ میں سے آواز آتی ہے۔

"جانو ٹھہری ہماری گھر اُوٹ ہیں۔" ایک عورت ٹھو کا دیکر اس سے کہتی ہے۔ وہ درگاہ کی طرف بھاگتی ہے۔ جہاں بھورے خاں کا پروگرام ختم ہو چکا ہے۔ اب امرتی جلیبی اور "کانڑے بھانڈ۔" کا نمبر ہے۔

لڑکی دوڑتی ہوئی چبوترے کی سمت آتی ہے جہاں ایک یک چشم مسخرہ بے پھندنے کی ترکی ٹوپی اور سرخ واسکٹ اور سلیپنگ سوٹ کا نیلا دھاری دار پائجامہ پہنے ایک مختصر سا ہارمونیم سنبھال چکا ہے۔ ایک مدقوق عورت، دھسٹر شال میں لپٹی ڈھولک اپنے آگے سرکاتی ہے۔ ایک کمسن بچی قریب بیٹھی مجمع کو غور سے دیکھ رہی ہے۔ مدقوق عورت اسے ایک تھپڑ رسید کرتی ہے "اری بدذات ادھر کیا بیٹھی ہے۔ تموا کی مٹھوا۔ سامنے آکر بیٹھ ر۔"

"خالہ ہمیں اٹھاؤ تو۔" بچی نرمی سے کہتی ہے۔

"سات فاقوں پر بھی وزن ہے کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ مرنے جوگی کا۔" مدقوق عورت بڑبڑاتی ہے۔ اتنی دیر میں نیلی شلوار ہرے دوپٹے والی لڑکی چبوترے پر پہنچ جاتی ہے۔

"بجیا۔" بچی اس کی طرف باہیں پھیلاتی ہے۔ بڑی لڑکی اسے گود میں اٹھا کر ہارمونیم کے سامنے بٹھال دیتی ہے۔ بچی اپنی خشک ٹہنی ایسی ٹانگ کو احتیاط سے اپنے منے سے غرارے میں چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ اب یک چشم مسخرہ سر ترچھا کر کے ہارمونیم پر تیز تیز انگلیاں چلاتا ہے۔ بڑی لڑکی کان پر ہاتھ رکھ کر تان لگاتی ہے "چلو۔ چلو امرتی جلیبی گا رت ہیں ر"

مجمع میں بھنبھناہٹ۔

بڑی لڑکی نے گانا شروع کر دیا ہے۔

"سفر ہے دشوار — سفر ہے دشوار — خواب کب تک۔ بہت بڑی منزل عدم ہے۔"
لنگڑی بچی مصرع ثانی اٹھاتی ہے "نسیم جاگو — نسیم جاگو — کمر کو باندھو۔ اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے۔"

سامعین سر ہلا ہلا کر جھوم رہے ہیں۔

"جوانی و حسن، جاہ و دولت، یہ چند انفاس کے ہیں جھگڑے —" اپاہج بچی بڑی محنت سے بڑی بہن کا ساتھ دیتی ہے۔

اجل ہے استادہ دست بستہ، نوید رخصت ہر ایک دم ہے۔ لسانِ دست سوال سائل تہی ہوں ہر ایک مدعا سے۔" بڑی لڑکی، شین قاف سے درست، نہایت سلیقے سے گا رہی ہے۔

"— نیاز ہے بے نیازیوں سے بغل میں دل صورت صنم ہے۔"

"حق اللہ —" ایک کالا بھجنگ ملنگ نعرہ لگا کر فرش پر لوٹنے لگتا ہے "اللہ ہُو — اللہ — اللہ ہو — اللہ —"

"مآلِ کارِ جہانِ فانی کبھی نہیں ایک قاعدے پہ۔ جو چار دن ہے وفورِ راحت تو بعد اس کے غم و الم ہے —"

گاؤں کے چودھری حامد علی کے چچا زاد بھائی جو مقدمے بازی میں لٹ پٹ چکے ہیں زور زور سے فرش پر ہاتھ مارتے اور روتے ہیں۔ اور چلا چلا کر دہرا رہے ہیں "جو چار دن ہے۔ واہ رے اللہ — واہ — واہ رے مولا واہ — دیکھ لی تیری قدرت — دیکھ لی —"

"زبان رو کو بہک رہے ہو، سرور دوشینہ جوش پر ہے۔" بڑی لڑکی ان کو مخاطب کر کے گاتی ہے۔ اب چند لوگوں کو حال آ رہا ہے۔ جوش و خروش بڑھتا جاتا ہے۔ معذور بچی کو ایک چشم مسخرے نے اپنے کاندھے پر بٹھا لیا ہے۔ وہ اپنے منے منے ہاتھوں سے تال دے کر بہن کی ہمنوائی میں مصروف ہے۔ "زبان رو کو بہک رہے ہو۔ سرور دوشینہ جوش پہ ہے۔"

"یہ مصرع بجز مصیبت پسند ہم کو کمال آیا۔ نسیم جاگو۔ کمر کو باندھو۔ اٹھاؤ بستر۔ کہ رات کم ہے۔"

عزت زدہ سامعین اکنیاں دونیاں مدقوق عورت کی طرف پھینکتے ہیں جو وہ اپنا دوپٹہ پھیلا کر اس میں سمیٹتی جا رہی ہے۔

"کھسکے ڈبل۔ کھسکے ڈبل۔ کھسکے ڈبل۔"

بڑی لڑکی رشکِ قمر عرف قمرن عرف امرتی ٹھمکی لگاتی گاؤں کے سفید پوشوں کی طرف جاتی ہے جو اسے چونی اٹھنی دیتے ہیں۔ سب ملا کر ساڑھے سات روپے بنے۔ رشکِ قمر مایوسی سے پیسوں پر نظر ڈال کر ان کو دوپٹے کی گرہ میں باندھ لیتی ہے۔

مجمع چھٹنے لگتا ہے۔ قمرن کا کنبہ اپنا ساز و سامان سمیٹ کر چبوترے سے اترتا ہے وہ درگاہ کے احاطے سے نکل کر نانبائی کی دوکان کی طرف جاتے ہیں جہاں ان کا زادِ راہ ایک کونے میں رکھا ہے۔ نانبائی بھی اپنی دوکان بڑھانے میں مشغول ہے۔ قمرن ٹین کا چھوٹا سا بکسا کھول کر بڑی احتیاط سے اپنے دونوں کلپ اس میں رکھتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں۔

"ٹسوے کیوں بہاتی ہے کم نصیب۔" مدقوق عورت برقعہ سر پہ ڈالتے ہوئے اسے جھڑکتی ہے۔

جمیلن کو اٹھا۔"

"کمانا تو کما لو۔" نان بائی المونیم کے کٹوروں میں تھوڑا تھوڑا شوربا اور چار نان ان کو دیتا ہے وہ زمین پر اکڑوں بیٹھ کے سر جوڑ کر طعام شب تناول کرتے ہیں۔ نان بائی ان سے پیسے نہیں لیتا۔ اب یک چشم بھانڈ ریلوے قلی کی سی پھرتی سے ٹرنک اور دری میں لپٹا بستر اپنے سر پر دھرتا ہے۔ ہارمونیم کمر سے لٹکاتا ہے۔ عورت ڈھولکی سنبھالتی ہے۔ قمرن گود میں جمیلن کو اٹھا لیتی ہے۔ تینوں سر جھکائے یکوں کے اڈے کی سمت چل پڑتے ہیں۔ میلے کے بازار میں سے گزرتے ہوئے ننھی جمیلن سر موڑ موڑ کر للچائی نظروں سے چوڑیوں کی دوکان کو دیکھتی ہے۔ کانڑا بھانڈ چلتے چلتے ایک لمبا سانس لے کر درگاہ کو مخاطب کرتا ہے۔ "واہ پیر ہنڈے شاہ — بڑی آس مراد لے کر آپ کے دربار میں آئے تھے۔ ملا کیا۔ نو روپے سوا چھ آنے۔"

فرقان منزل کے زنان خانے میں ڈپٹی صاحب آرام کرسی پر بیٹھے آگے کو جھکے ایک ابرو اٹھا کر سر پر خضاب لگا رہے تھے۔ ڈپٹیائن آئینہ لئے سامنے کھڑی تھیں۔ ڈپٹی صاحب گنگناتے جا رہے تھے اور محوِ آرائشِ جمال تھے۔ دفعتہً انہوں نے کہا۔ "بیوی۔ ہم ژنسکِ قمر سے متعہ کر لیں؟"

ڈپٹیائن نے آئینہ اسٹول پر رکھا اور دِلّی کی بیٹھی ایڑیوں والی جوتیاں گھسیٹتی چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ اندر جا کر مسہری پر بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر باہر دالان میں جھانکا۔ شوہر عینک کا کیس اور سرفراز اخبار سنبھالے سر جھکائے مردانے کی طرف جا رہے تھے۔

ڈپٹیائن نے چبوترے پر نکل کر آواز دی۔ "چھیدو کی بی بی۔ ذرا قمرن کی خالہ کو تو بھیجنا۔"

چھیدو کی بی بی چبوترے کے نیچے سے نمودار ہوئیں اور ڈیوڑھی کی طرف چلیں۔

یہ فرقان منزل ڈپٹی صاحب کے پردادا نے بنوائی تھی۔ جو سنا ہے قندھار کے گورنر تھے۔ ڈپٹی صاحب کے مخالفین کا قول تھا کہ واجد علی شاہ کے اصطبل میں سائیس تھے۔ اب واللہ عالم۔ ڈپٹیائن پیٹ بھر کے کنجوس تھیں۔ چبوترے کے نیچے کا تہ خانہ دو روپے مہینہ کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔ کرائے دار عورتیں فرقان منزل میں محنت کام کاج کرتیں ان کے لڑکے بالے سودا سلف لاتے مر د فجر کے وقت باہر نکل جاتے مٹیلے چلاتے پتنگیں بناتے یا یوں ہی ادائی توائی پھرتے۔ پھاٹک کے باہر بھی چار کوٹھریاں کرائے پر چڑھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک میں زنسک قمر کا کنبہ رہتا تھا۔ کانڑے خالو۔ سڑن خالہ۔ لنگڑی بہن۔ ہمہ خانہ آفتاب۔ اللہ توبہ۔ اللہ توبہ۔

پھیدو کی بی بی ڈیوڑھی سے نکل گلی میں پہنچیں۔ کوٹھری کے باہر کانڑے خالو۔ کبت کھولے بیٹھے تھے۔ ایک گاہک ان سے اپنا سر گھٹوا رہا تھا۔ اندر دھواں دھار کوٹھریا میں قمرن کی خالہ ہرمزی بیگم چولہا دھونک رہی تھیں۔ نوجوان جمیلن ایک جھلنگے پر پڑی چھت کی سیاہ کڑیاں گن رہی تھی۔ ایک کھونٹی پر ڈھولکی ٹنگی تھی۔ پھیدو کی بی بی نے ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر ہانک لگائی "ارے قمرن کی خالہ۔ تم کو ڈپٹیائن یاد فرماتی ہیں۔"

"آ گیا ملکن موت کا بلاوا" ہرمزی خالہ نے پھکنی پٹخ کر کہا۔ چند منٹ بعد بکتی جھکتی بڑبڑاتی اندر پہنچیں۔ ڈپٹیائن چبوترے پر ان کی منتظر تھیں۔ جا کر مناری کھڑی ہو گئیں۔

"آؤ بیٹھو۔" ڈپٹیائن نے فرش کی طرف اشارہ کیا۔

بیٹھ گئیں۔

"قمرن کی خالہ۔ ہم نے تم کو گرستن سمجھ کر کرائے دار رکھا تھا۔"

"تو کیا ہم گرستن نہیں ہیں؟" خالہ نے چمک کر کہا۔

"تمہاری لنگڑی بھانجی پر رحم کھایا؟"

"شکریہ عنایت؟"

بہت ہی بدعورت تھی۔

"تم نے ہم سے کہا تمہارا خاوند حجام ہے؟"

تو کیا گراس کٹ ہے۔

ہم سے لوگوں نے آ آ کر کہا آپ نے کن الفتوں کو گھر میں گھسا لیا گلی گلی گاتے بجاتے مانگتے
کھاتے پھرتے تھے؟"

آپ سے تو مانگ کر نہیں کھاتے۔

ڈپٹیائن تلملا کر رہ گئیں۔ مگر خالہ سڑن مشہور تھیں۔ انداز گفتگو یہی تھا۔

"زبان سنبھال کر بات کرو۔ اتنے جوتے لگواؤں گی کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ ٹھیک کہتے ہیں
کہنے والے کہ حسین آباد کی خانگیوں کا ٹبر ہے۔ ہم نے یقین نہ کیا۔ حضورؐ کی حدیث شریف میں آیا
ہے کہ جب تک خود نہ دیکھو کسی پر شک نہ کرو۔ لیکن اب ہم نے خود رشکِ قمر کو برقعہ اوڑھ
کر رات برات باہر جاتے دیکھا ہے۔ اب تم یہاں رہنے جوگی نہیں قمرن کی خالہ؟"

اماں اور قمرن کی خالہ کے جھگڑے کی آواز سن کر فرہاد میاں اوپر سے اُترے۔ آج یونیورسٹی نہیں
گئے تھے۔ دیر سے سو کر اٹھے تھے۔ زینہ طے کرکے آنکھیں ملتے چبوترے پر آئے۔ جمائی لے کر
دریافت کیا۔ "امی جان۔ کیا پھر رشکِ قمر کا کوئی مقدمہ پیش ہے؟"

"ارے ہم نے کتنی بھلائی کی ان بے گھردں ناشکروں کے ساتھ۔ ژنسک قمر کو اسکول میں ڈالا تمیز سلیقہ سکھایا۔" ڈپٹیائن نے فریاد کی۔

"امی جان۔ آپ اب خاموش رہئے۔ ہم آج سارا تیا پانچہ کئے دیتے ہیں۔ قمرن کی خالہ۔ آپ تشریف لے جائیے اپنی محلسرا۔"

"ارے طعنے نہ دو۔ بھیا۔ خدا کے غضب سے ڈرو۔" خالہ نے کمر پر ہاتھ رکھ کر فرش سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اور چبوترے سے اُتر کر باہر سٹک لیں۔

فرقان منزل کے شاہ پور آغا صفدر حسین خاں فرہاد قندھاری متعلم ایم اے (فارسی) کے کان میں اپنے قبلہ و کعبہ کی ژنسک قمر میں افلاطونی دل چسپی کی بھنک پڑ چکی تھی۔ غصے اور شرم سے بھنائے ہوئے چبوترے کی سیڑھیاں اُترے۔ ژنسکِ قمر عرف قمرن صحن کے ایک گوشے میں ہینڈ پمپ کے تھڑے پر اکڑوں بیٹھی منہ دھو رہی تھی۔ ریشمی ململ کا پستی دوپٹہ نزدیک گل مخمل کے پودوں پر سوکھ رہا تھا۔ تھڑے کی منڈیر پر گیسو درازنہ ہیر آئل کی بوتل اور صابن دانی میں لکس سوپ رکھا تھا۔

"یہ ٹھاٹ باٹ کہاں سے ہوتے ہیں۔"

ژنسکِ قمر نے منہ پر چھپکا مار کر سر اٹھایا، اس کی صورت دیکھتے ہی فرہاد میاں کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ "ژنسک قمر۔ منہ ہاتھ دھو لو تو اوپر ذرا ہمارے کمرے میں آنا۔"

"ڈپٹیائن وہ سامنے ہی بیٹھی ہیں۔" ژنسکِ قمر نے ہنس کر جواب دیا۔ فرہاد صاحب جھینپ کر گلابی ہو گئے۔ "واقعی خانگیوں کی اولاد ہے۔ بے حیا۔ آوارہ" انہوں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "ژنسکے۔ ہم تمہاری بھلائی چاہتے ہیں۔ یہاں روز تمہاری وجہ سے کوئی نہ کوئی شگوفہ کھل رہا ہے۔ اُوپر آؤ بیٹھ

کر سوچیں گے تمہارے لئے کیا بندوبست کیا جائے۔"

"بہت اچھا میاں۔ ابھی آتے ہیں۔ آپ جائیے۔" لڑکی نے اب اسی متانت سے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لگ چھپ کر مردانے زینے سے ہوتی دوسری منزل پر آغا فرہاد کی عملداری میں پہنچ گئی۔ وہ ایک دروازے کے پاس کرسی پر بیٹھے دیوانِ خانی کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ دروازہ جس کے نچلے حصے میں سلاخیں لگی تھیں گلی پر کھلتا تھا۔ بڑی سہانی ہوا آ رہی تھی۔

"جی فرمایئے" رشکِ قمر نے کمرے میں آکر میاں کی سے کہا۔

"قمرن" فرہاد صاحب نے کتاب کشمیری تپائی پر رکھ کر بات شروع کی "ہم دو سال سے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ تمہیں یہاں آئے ہوئے دو سال ہو گئے نا؟ پہلے کوئی شکایت تمہارے خلاف سننے میں نہیں آئی۔ جب تک اسکول جاتی رہیں کشمیری محلے میں امن قائم تھا۔ بھلا تم نے اسکول کیوں چھوڑ دیا۔؟"

"وہاں کے اوپر چند صاحبزادیوں نے اعتراض کیا تھا۔ ہم نے کہا جاؤ جہنم میں۔ ہم کون سا تمہارے ساتھ بیٹھ کر پڑھنا چاہتے ہیں۔"

"رشکِ قمر بیٹھ جاؤ۔"

وہ قالین پر بیٹھنے لگی۔

"نہیں۔ نہیں۔ یہاں۔"

وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آج ہمیں پورا قصہ بتا دو۔ یہ تم لوگوں نے کیا مسٹری MYSTERY بنا رکھی ہے۔"

"مسٹری کیا۔"

"راز۔"

"ہمارے کیا راز ہوں گے صاحب راز بڑے آدمیوں کے ہوتے ہیں۔ ہم بہت چھوٹے کمین لوگ ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ لیکن امی جان سے محلے والیاں طرح طرح کی باتیں جڑ رہی ہیں۔

"سب سچ کہتی ہیں۔"

"ہیں۔!"

"جی ہاں۔ ہم میں یہی تو ایک خوبی ہے میاں کہ ہم جھوٹ نہیں بولتے۔"

تم لوگ جب یہاں آئے تو کہا تھا کہ گاؤں میں کاروبار مندا تھا اس لئے شہر واپس آگئے۔"

"وہ بھی سچ کہا تھا۔ ہم لوگ گاؤں گاؤں گھومتے تھے۔ خالہ نے کہا جوتیاں چٹخاتے چٹخاتے تھک گئے اب شہر واپس چلو۔ یہاں کسی نے بتلایا آپ کے شاگرد پیشے میں کوٹھری کرائے کے لئے خالی ہے یہاں آگئے گانا بجانا البتہ چھوڑ دیا۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ گھر گھر ریڈیو بج رہا ہے۔ خالو اپنا پرانا کام کرنے لگے نائی کا سارے محلے کی حجامت بناتے ہیں۔ اس میں کون لمبے چوڑے راز کی بات ہے۔"

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے رشکِ قمر۔ شادی نہیں کرو گی؟"

"شادی۔ ؟"

"کیوں، تم کو تعجب کیوں ہوا۔ قاعدہ ہے جب لڑکیاں بڑی ہو جاتی ہیں ان کا بیاہ کر دیا جاتا ہے۔"

بڑی بڑی خاندانی لڑکیاں آج کل ماں باپ کے ہاں بیٹھی سوکھ رہی ہیں۔ ہم جیسوں سے بیاہ کوئی عقل کا اندھا ہی کرے گا۔ میاں آپ بھی کیا بھولی باتیں کرتے ہیں۔ لائیے ہمیں دکھائیے

آپ کیا پڑھ رہے تھے؟" اس نے کتاب تپائی سے اٹھالی اس کے ورق پلٹے۔ ایک غزل گنگنانے لگی۔

"ذرا زور سے ۔"

"دروازے بھیڑ دیجئے۔ نیچے سب آواز جاتی ہے۔"

فرہاد نے اُٹھ کر صحن کی طرف کھلنے والے دروازے بھیڑ دیئے، زُشکِ قمر نے ذرا اونچے سروں میں ترنم سے پڑھنا شروع کیا۔ فرہاد میاں مسحور و مبہوت سنا کئے۔ پھر یک لخت کرسی سے اُٹھ کر کہا "زشکے۔ ملاؤ ہاتھ۔ تمہارا کیریر سمجھ میں آگیا۔ ہم تمہیں شاعر بنا دیں گے۔"

آل انڈیا لیڈیز مشاعرہ قیصر باغ کی بارہ دری سے ریلے کیا جارہا ہے۔ محترمہ صوفیہ نسیم مسیح آبادی مشاعرے کی صدارت فرما رہی ہیں۔ ابھی آپ نے محترمہ نازنین بریلوی سے ان کا کلام سنا۔ اب لکھنؤ کی ہونہار شاعرہ مس زُشکِ قمر سے اُن کی تازہ غزل سماعت فرمایئے۔ آیئے بہن زُشکِ قمر۔"

مشاعرے کے اختتام پر زُشکِ قمر نے اپنا لیڈی ہلٹن کا سیاہ برقعہ اوڑھا اور پچھلے دروازے سے نکل کر گیلری میں پہنچی جہاں آغا فرہاد سیاہ شیروانی سفید پائجامے میں ملبوس اپنی بیاض ہاتھ میں لئے ریڈیو اسٹیشن کے ایک نوجوان افسر سید صاحب کے ساتھ موجود تھے۔ سید صاحب نے ہیڈ فون اتارا۔ ان کے آدمیوں نے اپنا انگر کھنگر سمیٹنا شروع کیا۔

"زُشک صاحبہ آپ کے ترنم نے مشاعرہ لوٹ لیا۔" سید صاحب نے مسکرا کر کہا۔ زُشکِ قمر نے نقاب الٹ کر تسلیم عرض کی۔

"اب چپکے سے نکل چلو۔ ورما صاحب نے تمہارے لئے ایک اور پروگرام بنایا ہے۔" آغا فرہاد نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ پروگرام کل بتائیں گے۔ اچھا بھئی سید کل تم سے ورما کے ہاں ملاقات ہوگی؟"

آغا فرہاد کے ساتھ باہر آکر زنسک قمر تانگے پر سوار ہوئی۔

"تم سے کسی نے سوالات تو نہیں کئے۔ غیر ضروری —" فرہاد نے دریافت کیا۔

"سوالات ہمیشہ غیر ضروری ہوتے ہیں۔" زنسک قمر نے کہا۔ "لیکن اب آپ کون سا نیا پروگرام سوچ رہے ہیں؟"

یہ بھی غیر ضروری سوال ہے۔ خاموش رہو اور دیکھتی جاؤ۔ ہم تمہارا کیریئر بنا رہے ہیں۔"

تانگہ پلٹنے نالے کے ایک مکان پر جا کر رکا۔ اس کے دروازے پر بھی ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔ لیکن یہ مکان فرقان منزل کی اس کوٹھری سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ ڈیوڑھی کے اندر چھوٹا سا آنگن۔ کھپریل کا برآمدہ۔ اندر دو کمرے ڈیوڑھی کے پاس بیت الخلاء۔ دوسری طرف باورچی خانہ۔ امرود کے درخت کے نیچے پانی کا نل۔ زنسک قمر کو مشاعروں سے آمدنی ہو رہی تھی۔ ریڈیو پر گانے کے پروگرام مل رہے تھے۔ چھ سات مہینے میں کایا پلٹ گئی۔ خالو اب کسی بڑھیا ہیر کٹنگ سیلون میں ملازمت کرنا چاہتے تھے۔ مگر ہمشیرہ خالہ نے منع کر دیا کہ لوگ کہیں گے مس زنسک قمر کے خالو نائی ہیں۔ ان کو فرہاد صاحب نے ایک دوکان میں جلد سازی کے کام پر لگوا دیا تھا۔

دوسرے روز شام کے پانچ بجے قمرن اور جمیلن برقعے اوڑھے نظر باغ فرہاد صاحب کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچیں۔ بالائی منزل کی بالکنی میں میاں فرہاد انتظار ساغر کھینچ رہے تھے اشارے سے اوپر بلایا۔ جمیلن کے لئے نئی بیساکھی آگئی تھی مگر اُسے زینہ چڑھنے میں دقت ہوتی تھی۔ فرہاد خود دوڑتے ہوئے نیچے گئے اس بے چاری کو سہارا دے کر دوسری منزل پر لائے گیلری میں ایک دروازے پر بورڈ لگا دیا تھا۔ "نریندر کمار ورما جرنلسٹ (گولڈ میڈلسٹ) ڈائرکٹر اینڈ آرٹ ایڈوائزر"؛

اندر کمرہ منہ سے بول رہا تھا کہ ایک خالص انٹلکچوئیل کی بیٹھک ہوں۔ دیواروں پر چغتائی کے پرنٹ۔ ایک طرف غالب دوسری طرف ٹیگور۔ کونے میں فلور لیمپ۔ بک شیلف میں انگریزی اردو کتابیں۔ نیچی طویل میز پر اردو کے ترقی پسند جریدے اور چند تازہ بتازہ پاکستانی رسالے۔ فرش پر رنگین چٹائی کشتی میں اسٹوڈیو پوٹری کا ٹی سیٹ۔ صاحب خانہ فرش پر بیٹھے۔ ریڈیو اسٹیشن والے دوست سے مصروف گفتگو تھے۔

ایک دیوان پر ایک نازک اندام گوری سی سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی معمولی فالسئی ساری پہنے سہمی بیٹھی تھی۔ نو وارد لڑکیوں کو دیکھتے ہی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ صاحب خانہ فوراً کھڑے ہو گئے۔ قمرن۔ جمیلین کو بڑے تپاک سے تسلیمات عرض کی اور لوکری نما نہایت آرٹسٹک کرسیوں پر بٹھایا۔ ورما صاحب آغا فرہاد سے عمر میں چند سال بڑے تھے۔ موٹے سیاہ فریم کی عینک، سر پہ جھوابھر بال، کھادی سلک کا یاداحی کرتا۔ ہنر و جیکیٹ چوڑیدار پائجامہ۔ چہرے سے نیک دلی اور خوش خلقی ہویدا تھی۔ دیکھنے سننے میں بھی بُرے نہیں تھے۔

بیچلر اپارٹمنٹ تھا۔ ملازم چھوکرے کو آواز دی۔ وہ نہیں آیا تو جھنجھلا کر چار دانی اٹھائی اور کچن کی طرف بھاگے۔

"آپ نے اب تک بتایا ہی نہیں یہ کون صاحب ہیں۔" زینب قمر نے چپکے سے پوچھا۔

ریڈیو والے دوست دیوان پر بیٹھی چھریری لڑکی سے بات کر رہے تھے۔

"یہ — ؟" آغا فرہاد نے جواب دیا۔ "اسے لاجواب آدمی ہیں۔ رائیس زادے ہیں۔ ماں باپ زہی پر رہتے ہیں۔ انہوں نے یہ فلیٹ لے رکھا ہے آرٹ اور کلچر کی خدمت کے واسطے ہم نے

تمہارے متعلق انہیں بتایا۔ انہوں نے فوراً ایک اسکیم بنا ڈالی۔ ابھی دیکھو آکر بتلائیں گے۔

دریا صاحب چار دانی اٹھائے مسکراتے ہوئے واپس آئے۔ اب آنا فرہاد نے سرگوشی میں ان سے دریافت کیا۔ یار یہ لڑکی کون ہے؟"

"یہ ــ؟"

"پہاڑن ہے ــ!"

"یہ ستواں ناک۔ کنول نین! پتلی کمر آپ کو پہاڑن نظر آتی ہے؟"

"سنا ہے کہ ان کی کمر ہی نہیں ہے۔ خدا جانے ناڑا کہاں باندھتے ہیں"۔ فرہاد صاحب ایکے تانگے والوں کی طرح گنگنائے۔

"لاحول ولا قوۃ ــ" دریا صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔ اور گوری لڑکی دیوان سے مخاطب ہوئے۔ "موتی۔ ادھر آکر بیٹھو۔ لو۔ چار بنانا سیکھو۔ بھئی زنک قمر صاحبہ ذرا اب آپ ان کی تربیت کیجئے"۔

لڑکی دیوان سے اتر کر چٹائی پر آبیٹھی اور گھبرائی ہوئی سی سب کے چہرے تکتی رہی۔

"لو۔ چار بناؤ سب کے لئے۔" دریا صاحب نے ٹرے اس کے آگے سرکائی۔

"چوکے میں بیٹھنا چھوڑ میری سرن۔ چھری کانٹے سے کھانا سیکھ۔ لہنگا پہننا چھوڑا میری سرن۔ سایہ پہننا سیکھ۔ پیڑھی پر بیٹھنا چھوڑ میری سرن۔ ارے دھرلے کنوئیں پہ تنبورے تالے مینھیں دے گڑوائے۔ مینھیں دیں گڑوائے ــ" سید صاحب نے جو خالص دلی والے تھے الاپنا شروع کر دیا۔

"یہ کیا ہے۔ کہاں کا لوک گیت ہے؟" دریا نے دل چسپی سے پوچھا۔

"ایک دیہاتن پر دتی کا انگریز ریذیڈنٹ عاشق ہو گیا تھا۔ اس کے متعلق اس زمانے میں ہماری طرف یہ گیت گایا جاتا تھا۔"

"پھر کیا ہوا۔۔۔؟"

"وہ انگریز قتل کر دیا گیا۔"

"ولیم فریزر ۔۔۔؟" آغا فرہاد نے دریافت کیا۔

ہماری موتی پہ کوئی فرنگی عاشق ہو گیا تو ہم بھی اُسے قتل کر دیں گے۔" ورما صاحب نے اعلان کیا۔

"صاحب یہ قتل خون کی باتیں نہ کیجئے۔ بدشگونی ہے۔" زُشکِ قمر بولیں۔

"بھائی سنو۔" ورما صاحب نے سینڈوچز سرد کرتے ہوئے فرمایا۔ پچھلے ہفتے ہم گئے تھے علی گنج کے میلے۔ والدہ کو لے کر۔ وہ بے چاری ہنومان جی کے مندر جا کر ہمارے لئے منتیں مانتی ہیں کہ ہم راہ راست پر آجائیں یعنی اپنا گھر بسائیں۔ اب خدا کی قدرت دیکھئے کہ والدہ تو گئیں مندر کے اندر ہم ذرا کیمرہ لے کر نکلے برائے سرگشت تو آپ نظر آگئیں۔ ایک پیڑ کے نیچے کھڑی کجری گا رہی تھیں پوری ٹولی ساتھ تھی۔ قیامت کی آواز ہے۔ بس زُشکِ قمر صاحبہ آپ کے توڑ پر ہیں۔ ہم نے آپ کو ریڈیو پہ کئی دفعہ سنا ہے۔"

"تو آپ ان کو ٹپا کے یہاں لے آئے۔" زُشکِ قمر نے بے تکلفی سے ہنس کر کہا۔

"بڑی مشکل ہے خاص الخاص ضلع فیض آباد کی پاتر ہیں۔"

"اور والدہ کو معلوم ہو گیا تو ۔۔۔؟" آغا فرہاد نے پوچھا۔

ابھی تو انہیں کچھ علم نہیں ہے۔ ہم کیا کریں. بجرنگ بلی کی مرضی یہی تھی۔ اچھا بھئی۔ سنو ہماری سکیم ہم ایک سونگ برڈز کلب SONG BIRDS CLUB قائم کرتے ہیں۔ آپ تینوں بحیثیت لوک گیت ایکسپرٹ اس کی اسٹارز۔ شہر میں پروگرام کریں گے۔ ٹور پر جائیں گے۔ سونگ برڈز کلب اڑ جائے گا۔ ہم آرگنائزر آدمی ہیں۔ بلا کے ایفی شنٹ کل ہم آرٹ اسکول سے اس کے لیٹر پیڈ کا نمونہ بنوالیے دیکھیے ؟ انہوں نے کافی ٹیبل کے نچلے خانے سے ایک کاغذ نکالا۔ جس کی پیشانی پر لکھا تھا سونگ برڈز کلب " مینجنگ ڈائرکٹر این۔ کے۔ ورما۔ گوشے میں آم کا درخت اس پر چڑیاں۔ نیچے ایک لڑکی بیٹھی تنبورہ بجا رہی تھی۔ سب نے باری باری اس کاغذ کو ملاحظہ کیا۔

"جب چڑیاں ہیں تو لڑکی کی کیا ضرورت ہے۔ آغا فرہاد نے اعتراض کیا۔

بھائی آغا صاحب۔ یہ باریکیاں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ تم جا کے ہینگ پیچو۔ اور سنیے گا۔ ان کا نام تھا موتی۔ ہم نے رکھا ہے۔ صدف آرا بیگم موتی۔ " ورما صاحب نے لڑکی کو پالتو بلی کی طرح مخاطب کیا۔ " سو تی کہو صدف۔ "

" صدپھ۔ " لڑکی نے دہرایا۔

" ارے بھئی صدف۔ ف سے "

" صدپھ۔ پھ سے۔ "

" استغفر اللہ۔ کہو صدف آرا بیگم "

صدپھ آرا بیگم۔

ورما صاحب نے ایک طویل سانس لی۔ خیر۔ اللہ مالک ہے۔ کل سے ان کا شین کاف

درست کہنے کی INTENSIVE ٹریننگ شروع ڈیڑھ مہینے بعد سوگم برڈز کلب کا پہلا پروگرام ریڈیو پر بھی شیڈول کر لیا گیا ہے۔ کیوں میاں؟" انہوں نے سید صاحب سے دریافت کیا۔

"قطعی" انہوں نے پائپ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔

اب درما صاحب جمیلن کی طرف متوجہ ہوئے جو اس دوران میں چپکی بیٹھی غور سے سب کی گفتگو سن رہی تھی۔ ورما صاحب نے اسے بڑے دھیان سے دیکھا۔ پھر دفعتہً چٹکی بجا کر بولے۔ کماری جل بالا لہری ۔"

"کون ۔۔۔؟ ہم ۔؟ ہمارا نام جمیل النسار بیگم ہے" جمیلن نے بگڑ کر کہا۔

"کماری جل بالا لہری" ورما صاحب نے قطعیت کے ساتھ دہرایا "شکل میں بالکل بنگالی ملاحت ہے۔ آپ بنگال سے کل آئی ہیں۔ جل بالا لہری۔

"یہ جلا بلا کون بلا ہے؟ اور بنگال سے آئے ہماری بلا۔ ہم حسین آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ اب پاٹے نالے پر رہتے ہیں۔"

"ارے بھائی ہم تمہارا کیریئر بنا رہے ہیں۔"

"کیریر ٹیریر سر پیر ۔۔۔ وہ کیا ہوتا ہے؟"

"تمہارا مستقبل ۔"

"ارے ہمارا کیریر اللہ میاں نہ بنا پائے آپ کیا بنائیں گے۔" جمیلن نے خشکی سے جواب دیا۔

"نعوذ باللہ ۔۔۔ کیا کفر بکتی ہے۔ ورما صاحب نے بُرا مان کر کہا۔

"جل بالا لہری ۔۔۔" اس لئے کہ ہم لہرا کے چلتے ہیں؟" "خوب نام سوچا۔"

"لہری کیوں ۔ ؟ اس لیے کہ ہم لہرا کے چلتے ہیں؟" جمیلن نے سوال کیا۔

"ارے بھائی ذرا اس الٹی کھوپڑی کی لڑکی کو سمجھاؤ" ورما صاحب نے عاجز آکر کہا "لہری ایک SURNAME ہے۔"

ورما صاحب ہم انہیں سمجھا لیں گے۔ اب آپ بتائیے۔ ریہرسل کب سے شروع کریں گے۔

ڈشک قمر نے دریافت کیا۔

ورما صاحب پیڈ پر لکھنے میں مصروف ہو چکے تھے۔

سونگ برڈز کلب ۔

صدف آرا بیگم ۔

مس ڈشک قمر

کماری جل بالا لہری ۔

"ہلو — ہلو — جی ہاں - میں ورما بول رہا ہوں۔ آغا آداب عرض۔ مزاج عالی — ارے صاحب آپ کہاں تھے۔ دلی سے کب آئے آپ نے ہمارا کونسرٹ MISS کر دیا۔ جی ہاں۔ بہت شاندار رہا۔ ایک منسٹر نے اودگھاٹن کیا۔ خوب تصویریں کھینچیں۔ زبردست پبلسٹی رہی۔ اور ہاؤس فل۔ جی نہیں صرف لائٹ میوزک۔ ہماری آرٹسٹ لوگ غزل اور گیت کی ایکسپرٹ ہیں۔ پریس نے خوب عمدہ ریویو کیے۔ اس وقت — ؟ بھئی معاف فرمائیے گا۔ بات یہ ہے کہ آج جنگل کی شام ہے والدہ صاحبہ کو ایک کیرتن میں لے جانا ہے۔ آج تو تشریف نہ لائیے ہم اس وقت نہ ہی جا رہے ہیں۔ اپنے مکان پر — جی ہاں - جی ہاں۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں۔

تو اگلے اتوار کو۔ بہت آداب عرض "۔ ورما صاحب نے فون کا ریسیور واپس رکھ کر ایک گہری سانس بھری آکر دیوان پر گر گئے اور فرمایا "دعائیں ہی آڑے وقت پر کام آتی ہیں"۔

اماں کیوں اتنا سفید جھوٹ بولتے ہو۔ وہ تو ٹل رہے ہیں۔ کہنے لگے والدہ صاحبہ کو کیرتن میں سنے جانا ہے"۔ فرہاد نے چٹائی پر لیٹے لیٹے کہا "کون تھا۔؟"

"ایک مہا لبد۔ پروگرام کی کامیابی کی مبارک باد دینے آرہے تھے۔ ہم نے ٹال دیا۔ ارے بھائی صدف آرا رے" ورما صاحب نے آواز دی۔

صدف آرا کچن میں کچالو بنا رہی ہیں"۔ رشکِ قمر نے کہا۔ وہ کرسی پر بیٹھی ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

صدف آرا نے آج تم کے لئے بہت بڑھیا کھانا بنایا ہے"۔ ورما صاحب بولے۔

"بہت بھلی لڑکی ہے"۔ قمرن نے کہا۔

ورما صاحب اچانک جوش میں آکر اُٹھ بیٹھے "تم تینوں بہت بھلی لڑکیاں ہو۔ سنو رشکِ قمر ہم نے ایک اور اسکیم بنائی ہے۔

"بات سنو۔ ہم ایک اردو رسالہ نکالیں گے۔ کل ہی جا کر ڈیکلریشن داخل کرتے ہیں۔ اس کا نام بھی سوچ لیا ہے۔ گوہر شب چراغ"۔

سبحان اللہ۔ فرہاد نے کہا۔

"صدف آرا بیگم اور گوہر شب چراغ آپ کا جواب نہیں۔

"اور پہلے شمارے میں ایک مضمون لکھیں گے۔ رشکِ قمر کے متعلق۔ یہ دیکھو" انہوں نے کاغذ پر

جلدی جلدی کچھ گھسیٹا اور کاغذ ژشکِ قمر کو پیش کیا۔

"ممکن عنوان —

ژشکِ قمر کی شاعری۔

ژشک قمر کا نظریۂ فن۔

ژشکِ قمر کا فلسفۂ حیات۔

ژشکِ قمر کے ساتھ ایک شام۔

" ژشک قمر کے شب و روز —"

آغا فرہاد نے کاغذ لے کر پڑھا اور بولے — یہ آخری عنوان پسند آیا۔"

آپ لوگوں کو ہمارا مذاق اڑاتے شرم تو نہیں آتی، ژشکِ قمر نے اداسی سے کہا

" مذاق — ! کمال کرتی ہو — ہم تمہارا ادبی کیریئر بنا رہے ہیں۔" ورما صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔

جمیلن صوفے پر لیٹی تھی بیساکھی کے سہارے اٹھنے کی کوشش کی۔ ورما صاحب اور آغا فرہاد دونوں ان کی مدد کے لئے لپکے۔ اچانک جمیلن سر جھکا کر رونے لگیں۔

" جلی مَن — جمیلن — کیا ہوا ؟" ورما صاحب نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

" کچھ نہیں ورما صاحب "۔ جمیلن نے کشمیری سلک کی ساری کے پلو سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔" ہمیں ابھی ابھی یہ خیال آیا کہ ۔"

" کیا — کیا — ؟"

"۔۔ کہ ہم نے زندگی میں کبھی سُکھ چین دیکھا ہی نہیں۔ اب جو اچانک یہ ہمارا ماحول بدلا ہے۔
اس میں بھی کوئی دھوکہ نہ ہو۔ بجیا تو سخت جان ہیں۔ ہم نہیں ہیں۔"

کیسی باتیں کرتی ہو بھائی جلی من۔ جمیلن ۔" ورما صاحب نے انتہائی خلوص کے ساتھ کہا۔

"ارے آپ لوگ ہماری رام کہانی سنیں تو یقین نہ آئے گا۔" زینب قمر کافی بناتے ہوئے بولیں۔
لیکن ہمیں ہمدردی وصول کرنے سے نفرت ہے اور شرم بھی آتی ہے۔"

ہمیں نہیں آتی شرم۔ جب قدرت کو ہماری یہ دھچا بناتے شرم نہ آئی تو ہمیں کیوں آئے۔ جمیلن
نے رومال سے ناک پونچھتے ہوئے کہا۔ ورما صاحب نے کافی کی پیالی پیش کی۔

" ہم پیدا ہوئے اماں ہماری پیدائش ہی میں مرگئیں۔ جمیلن نے کافی کا گھونٹ بھر کے کہا۔" ہم
لنگڑے پیدا ہوئے۔ خالہ نے پالا۔ گلیوں میں رُل کر لوٹ پیٹ کر پانچ چھ سال کے ہوئے۔ اماں کے
مرنے کے بعد گھر کا خرچ چلانے والی صرف خالہ رہ گئیں۔ ان کو ہو گئی تپ دق۔ اماں جو کچھ جوڑ جکوڑ
گئی تھیں۔ وہ خالہ کی دوا دارو میں اُٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے کہا بھوالی جاؤ۔ جو تھوڑا سا پیسہ بچا تھا اسے
لے کر ہر مزی خالہ نے بھوالی جانے کی ٹھانی۔"

" اور یہ تمہارے خالو؟" ۔ آغا فرہاد نے بات کاٹی۔

بتاتے ہیں سنتے جایئے۔ یہ ایک حجام ہیں۔ ہمارے عقیقے کے لئے بلائے گئے تھے۔ ان بچارے کو
ہم لوگوں سے ہمدردی ہو گئی کبھی کبھار آنکلتے۔ خالہ تو پہلے اُن سے اپنی چلم بھروانے کی بھی روادار
نہیں تھیں۔ لیکن پردے میں ملتی تھیں۔ بیمار پڑیں تو لوگوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ اب دوا علاج
کی دوڑ بھاگ کون کرے۔ ہم چھ سال کے تھے بجیا دس گیارہ سال کی یہ جمیلن خان حجام

بے چارے باہر کے کام کر دیتے۔ ان کے بیوی بچے مر چکے تھے۔ وہ بھی اپنائیت کے دو بولوں کے بھوکے تھے۔ کہنے لگے میں تم لوگوں کے ساتھ بھوالی چلوں گا۔ حسین آباد کا مکان بھی کرائے کا تھا۔ ہم لوگ بوریا بستر باندھ کاٹھ گودام روانہ ہوئے۔

• اب یہ لنگڑے یک چشم جمن خان تھے بڑے عیبی۔ گانجے افیم کی لت انہیں۔ جوا یہ کھیلیں۔ خالہ ہم اور بجیا زنانہ تھرڈ کلاس میں سوار ہوئے۔ وہ مردانے ڈبے میں جا بیٹھے۔

مرے کو ماریں شاہ مدار۔ سارا پیسہ خالہ نے ان کے حوالے کر دیا تھا۔ کہ حفاظت سے رکھیں گے۔ وہ خود روگی۔ ہم دونوں بچیاں۔ خیر کاٹھ گودام ٹرین پہنچی۔ ہم لوگ اُترے۔ تو جمن خان اپنے ڈبے سے اُتر کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ بولے رات کو سوتے میں کسی نے جیب کاٹ لی۔ خالہ نے کہرام مچا دیا۔ عیبی۔ بدذات۔ بھانڈ۔ شہدے۔ کسی مسافر کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھا ہوگا۔ ساری رقم ہار گیا۔ انہوں نے حمائل شریف ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ کسی جیب کترے نے بٹوہ پار کر دیا۔ انہوں نے جوا نہیں کھیلا۔ ہم لوگ اپنی قسمت کو روپیٹ کر پلیٹ فارم پر بیٹھ گئے۔ اب کیا کریں جو ناشتہ ساتھ وہ ختم ہوگیا۔ خالہ کے پاس دو روپے تھے۔ وہ بھی خرچ ہو گئے اب کھائیں کہاں سے جمن خاں اپنی کسبت ساتھ لائے تھے۔ دوسرے دن وہ پلیٹ فارم کے سرے پر جا براجے۔ مسافروں کی حجامت بنانے لگے۔ پھر خالہ کی سمجھ میں ایک بات آگئی۔ وہ ہارمونیم ڈھولکی بھی ساتھ لائی تھیں۔ انہوں نے ڈھولک بجیا کے آگے سرکا دی۔ بجیا نے گانا شروع کیا۔ مسافروں کی بھیڑ لگ گئی۔ تھوڑی سی آمدنی ہوئی۔ نینی تال جانے والے امیر لوگ ہمارا گانا سن کر ادھر آجاتے۔ روپیہ دو روپیہ دیدیتے۔ ریلوے اسٹیشن پر پڑے کئی دن گزر گئے۔ تو پولیس

نے ہنکال دیا۔ نزدیک لکڑیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ایک سائبان تھا اس میں جا بیٹھے۔

کاٹھ گودام بھی آدھا نینی تال سمجھو۔ خالہ کی طبیعت بہتر ہونے لگی۔ ذرا دم آیا تو کسی نے جمن خان سے کہا آس پاس کے گاؤں میں گا بجا کر کافی کما سکتے ہیں۔ ہم لوگ لاری میں بیٹھ کر ہلدوانی پہنچے۔ پھر وہاں سے اور آگے ترائی کے علاقے میں گھومنے لگے۔ افضل گڑھ، لال ڈانگ، کالا گڑھ وہاں باگھ بگھیلوں کی کثرت تھی۔ رات کو ہم لوگ کسی جنگل کے راستے سے گزرتے شیروں کے دہاڑنے کی آواز آتی۔ اکثر خالہ مجھے کوستیں کمبخت کوئی شیر بھی آکر اسے نہیں کھاتا۔ میں بھی کبھی کبھی دعا مانگتی اللہ میاں کوئی شیر بھیج دو جو آکر مجھے کھا جائے۔ لال ڈانگ میں کوربٹ صاحب کا بنگلہ تھا۔ وہ آدم خوروں کی تلاش میں بندوق اٹھائے جنگل جنگل گھومتا تھا۔

اس علاقے کی آب و ہوا اتنی اچھی تھی کہ خالہ جو برسوں حسین آباد کے گندے مکان میں محبوس رہی تھیں۔ اچھی ہونے لگیں۔ وہ بڑا سرسبز پُرفضا علاقہ تھا۔ وہاں کچے راستوں پر اب بھی دو منزلہ شکر میں چلتی تھیں۔ ہم لوگ وہاں کئی برس گھومے۔ افضل گڑھ میں عیسائیوں کا مشن تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے اشارۃً ہم سے کہا کہ تم سب عیسائی ہو جاؤ اور ہماری تبلیغی ٹولی میں شامل ہو کر گاؤں گاؤں اسی طرح یسوع مسیح کے بھجن گاؤ تو تمہارا علاج بھی کرا دیں گے۔ اسکول کالج میں پڑھا بھی دیں گے۔ میں نے خالہ سے کہا۔ ہو جاؤ عیسائی۔ خدا نہ یہاں ہے نہ وہاں فرق کیا پڑتا ہے۔ تمہارا اور میرا علاج تو ہو جائے گا۔ بھیا اسکول میں داخل ہو جائیں گی۔ ان کی زندگی بن جائے گی۔ خالہ ہمیشہ کی ہتھ چھٹ۔ انہوں نے مار مار کر ہمیں آلو بنا دیا۔ "ٹانگ تو غارت ہوئی۔ بدبخت ایمان بھی کھونے پر تیار ہے۔" خیر — ان مشنری عورتوں نے ہمیں

اور بجیا کو تھوڑی سی انگریزی پڑھا دی آدن کا کام سکھلا دیا۔

"جمن خان ذات کے بھانڈ تھے۔ ان کے دادا پردادا شاہی دور کے لکھنؤ میں نامی گرامی بھانڈ تھے۔ زمانہ بدل گیا۔ ان کے فن کے قدر دان نہ رہے۔ جمن خان نے مجبوراً نائی کا کام سیکھ لیا۔ اب بھی ان کو تین چار نقلیں یاد تھیں۔ بے چارے بڑی کوشش سے میلوں ٹھیلوں میں پیش کرتے۔ بجیا اور ہم گاتے۔ خالہ ڈھولک بجاتیں۔ بے چاری خالہ نے ان سے نکاح کر لیا تھا۔ گنواروں نے ہمارا نام جمیلن سے جلیبی کر دیا۔ بجیا امرتی کہلاتی تھیں۔ بڑی کٹھن زندگی تھی۔ لیکن خالہ حسین آباد واپس آنے کے لئے تیار نہ تھیں۔ انہیں یقین تھا ٹاٹ کے پردے کے پیچھے مقید ہو کر انہیں پھر ٹی بی ہو جائے گی۔ لیکن گاؤں اور قصبوں میں اتنی غربت تھی، زمینداروں کی تقریبوں میں پانچ دس روپے ایک آدھ جوڑا کپڑا مل جاتا تھا۔ بڑی مشکل سے گزر ہو رہی تھی۔ پھر پاکستان بنا۔ سکھ ریفیوجیوں کو بسانے کے لئے جنگل کاٹے گئے۔ اس علاقے میں پنجابی شرنارتھی آباد ہونے لگے وہ ہمارے گانوں اور نقلوں کو کیا سمجھیں۔ ہم لوگوں نے پھر اودھ کا رخ کیا۔

وہاں ایک قصبے میں ہم لوگ ایک سرائے میں ٹکے تھے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ رمضان کا مہینہ مجھے وہ رات اب تک اتنی صاف یاد ہے۔ ۲۱ رمضان کی شب تھی۔ خالو گاؤں کی مسجد میں تراویح پڑھنے گئے ہوئے تھے میں اور خالہ اور بجیا سرائے کے برآمدے میں بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ خالو کا قاعدہ تھا کہ مسجد سے سحری کھا کر واپس آتے تھے۔ کیونکہ وہاں گاؤں والے دینداروں کی بھیجی ہوئی سحری کھانے کو مل جاتی تھی۔ سحری کے بعد بستی کی طرف سے نوحے کی دلدوز آواز سنائی دی۔ ابن ملجم نے حیدر کو مارا۔ خالہ بجیا اور میں بھی وہی نوحہ پڑھنے لگے۔

اور راستے دُکھ جھیلے تھے کہ خوب خوب روئے۔ اسی وقت ڈھاٹے باندھے ڈاکو صحن میں آکودے
ایک ڈکیت بجیا کو اُٹھا لے جانے کے لئے آگے بڑھا۔ سرائے کے آنگن میں سحری کے لئے جگہ
جگہ چولہے جل رہے تھے۔ ہماری چیخیں سن کر سارے مسافر دوڑ پڑے۔ ڈاکوؤں کو مار بھگایا۔ مگر
ہم تینوں دہل کر رہ گئے۔ خالو فجر پڑھ کر مسجد سے لوٹے۔ خالہ نے کہا آج ہی شہر واپس چلو۔ دیہات
سے بھر پائے۔ چنانچہ ہم لوگ لکھنؤ واپس آگئے۔ یہاں آغا فرہاد کے شاگرد پیشے میں ایک کوٹھری
کرائے کے لئے خالی تھی اس میں آن بسے۔"

درما صاحب اور آغا فرہاد مبہوت بیٹھے سن رہے تھے۔ جمیلن نے قصہ ختم کیا تو چونک پڑے۔
صدف آرا رجوز سوئی سے آچکی تھی کہانی سن کر آنسو بہا رہی تھی۔

مگر تعجب ہے۔ رشکِ قمر تم لوگ بھابھر کے علاقے میں پلی بڑھیں اور اردو تمہاری اتنی
نفیس ہے۔" ورما صاحب نے کہا۔

" ورما صاحب۔ جان صاحب کی ریختی خانگیوں ہی کی زبان تھی۔" آغا فرہاد بولے۔

" اور ہرمزی خالہ اور چمن بھانڈ کی تربیت!" رشکِ قمر بولی۔ ہرمزی خالہ سنگ گئی ہیں۔
لیکن اب بھی ان کو درجنوں شعر یاد ہیں۔"

" اوہو۔ ہمارا خیال تھا تم لوگ ذات کی میراثن ہو۔"

میراثنیں بے چاریاں شریف ہوتی ہیں۔ پیشہ نہیں کرتیں۔ دراصل ہمیں بجیا کو گانے کا بہت
شوق تھا۔ اس لئے خالہ نے ڈھولک منگوا دی تھی۔

پردہ نشین خانگیاں گاتی بجاتی نہیں ہیں۔ ہم سے پوچھئے۔ اچھا ایک بات بتاؤ۔ قمرن

عورتیں خانگیاں کیوں بن جاتی ہیں؟"

"یہ بھی نہایت غیر ضروری سوال ہے آغا صاحب۔ گویا آپ تو جانتے ہی نہیں" زشک قمر نے اکتا کر جواب دیا "انسان پیٹ کی خاطر سب کچھ کرتا ہے۔ شرافت درافت سب دھری رہ جاتی ہے۔ زیادہ تر خانگیاں سفید پوش بدحال گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ خود ہمارے نانا بیحد شریف بیحد غریب آدمی تھے۔ وہ مر ا گئے۔ اماں کو انہوں نے جس شریف غریب آدمی سے بیاہ دیا تھا وہ کسی وبا میں چل بسے۔ ہمارے باپ۔ ہم ڈیڑھ سال کے تھے۔ اماں سترہ برس کی عمر میں بیوہ ہوئیں۔ بالکل بے سہارا رہ گئیں تو مجبوراً ۔۔ ہمری خالہ کے میاں کسی فوجداری کے مقدمے میں پھنس گئے تھے۔ وہ پولیس سے چھپنے کے لئے لاپتہ ہو گئے۔ خالہ کے سسرالیوں نے بے چاری کو منحوس منحوس کہہ کر گھر سے نکال دیا۔ وہ بھی ناچار اماں کے پاس حسین آباد آگئی۔ جمیلن وہیں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ اسی شہر کے بڑے باعزت انسان ہیں۔ انہوں نے کبھی پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی۔"

"افوہ بھائی" درما صاحب نے ایک گہرا سانس لیا "صدف آرا سے سنو تو وہ بھی کم ستائی ہوئی نہیں ہے۔ اسے تیرہ برس کی عمر میں اس کی ماں نے ایک جھرٹوس زمیندار کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ وہ [illegible] ہی اس کی خوش قسمتی سے دو سال ہی میں لڑھک گیا۔ یہ گڑھی سے بھاگ کر پھر اپنے گاؤں واپس آگئی۔"

صدف آرا اب زار و قطار رو رہی تھی۔

کبھی آپ کے پاس وقت ہو تو ہمارے جمن خالہ سے ان کی داستان حیات بھی سنیئے گا۔

یہ جو آپ لوگ اپنی کتابوں میں بڑی اونچی اونچی باتیں لکھتے ہیں سب بھول جاتیں گے۔" جمیلن نے تلخی سے مسکرا کر کہا۔

" بھانڈوں کی حالت بہت المناک ہے۔" آغا فرہاد سر ہلا کر بولے " فاقے کر رہے ہیں۔ ہمارے بچپن تک بھانڈ اور سادھو بچے تقریبوں میں بلائے جاتے تھے۔ یارو رماتم کو مصطفےٰ حسین بھانڈ یاد ہیں۔ ؟ کیا زبردست فنکار تھے۔

" دھندلے سے یاد ہیں۔ ہماری بُوا کی شادی پر بارات کے ساتھ ہی تشریف لائے تھے۔"

درما صاحب نے جواب دیا۔

ہمیں خوب یاد ہیں اسّی برس کے تھے جب ہم نے دیکھا۔ اس عمر میں بھی کیا ناچتے تھے۔ باکمال رقاص تھے۔ اور بعض مرتبہ بس خاموش کھڑے ہو جاتے تھے۔ لیکن اس انداز سے کھڑے ہوتے تھے کہ محفل زعفران زار بن جاتی تھی۔ اور وہ ان کی گھوڑا چھوڑنے کی نقل۔ ارے یہ لوگ WEST میں پیدا ہوئے ہوتے تو ساری دنیا انہیں جانتی اور لکھ پتی ہوتے۔"

جمن خالو مصطفےٰ حسین صاحب سے اچھی طرح واقف تھے۔" زنک قمر نے کہا۔

" اب بتاؤ۔ بے چارے جمن خان کو نائی بننا پڑا۔" درما صاحب بولے۔

" یہ جو ہماری سوسائٹی میں بے چارے LOWEST OF THE LOW کہلاتے ہیں کبھی ان کی زندگیوں میں جھانک کر تو دیکھو ہمیں تو شہدوں پر بہت ترس آتا ہے۔ ساری عمر مردے اٹھانا۔ شادیوں میں نچھاور کے پیسے لوٹنا۔ عجیب و غریب گالیاں دینا۔ یہی ان کی زندگی ہے اور یہ اسی طرح اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اور گورکن اور مردہ شونیاں ۔" آغا فرہاد نے کہا۔

"بھائی اب زیادہ ڈیپرلیس نہ کرو۔" ورما صاحب اداسی سے بولے۔

"اور اب سونگ برڈز کلب۔" جمیلن نے اسی تلخ آواز میں کہا۔

لال باغ کی ایک نئی عمارت کی گیلری میں بورڈ۔

دفاتر سونگ برڈز انٹرز (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔

مینجنگ ڈائرکٹر۔

این کے ورما۔ گراؤنڈ فلور۔ سونگ برڈز اسکول آف لائٹ میوزک۔ پرنسپل صدف آرا بیگم

لس پرنسپل کماری جل بالا لہری فرسٹ فلور۔

"گوہر شب چراغ" اردو کوارٹرلی ڈیوٹڈ ٹو لائف اینڈ لٹریچر۔ پیٹرن۔ آغا فرہاد قندھاری۔ اڈیٹر

این کے ورما اسسٹنٹ اڈیٹر مس زنک قمر لکھنوی فرسٹ فلور

سونگ برڈز ڈانس اینڈ ڈرامہ گروپ فرسٹ فلور۔

ریذیڈنس منیجنگ ڈائرکٹر شری این کے ورما۔ سیکنڈ فلور

شری این کے ورما اپنی نفیس خواب گاہ میں مسہری پر نیم دراز گوہر شب چراغ" کا اداریہ لکھنے میں مشغول ہیں۔ صدف آرا بیگم ایک پتی ورتا استری کے مانند پائنتی بیٹھی ان کے پاؤں داب رہی ہیں۔ سہ پہر کا وقت، خدا اپنی جنت میں ہے اور دنیا میں ہر طرح سے خیریت۔

" ورما صاحب۔ اے ورما صاحب۔ ہم ای کہت رہن اگی۔"

"ہم یہ کہتے تھے کہ ۔۔"

"اچھا۔ ہم یہ کہتے ہتے کہ اب قمرن کا کا ہو یہے۔ جمیلن تبادت رہین مساعروں میں آنے والی ساعرہ لوگ ایجی ٹیشن کر رہی ہیں اکی جس مساعرے میں رشک قمر کو بلا جیئے وہ نہ جیہیں۔ ان کا چال چلن خراب ہے۔"

شاعرہ لوگ کا دماغ خراب ہے۔ تاریخ ادب اردو گواہ ہے کہ بہت سی ارباب نشاط صاحبِ دیوان گزری ہیں اور اہل نظر نے ان کی ہمیشہ قدر کی۔"

"کا ـــ"

"ارے یار۔ تم تو گدھیا۔ اب بک بک مت کرو۔ ہمیں مضمون لکھنے دو۔"

دوما صاحب۔ ہم ایک باری ایک سپنا دیکھے رہن۔ اکی تم ہم سے بیاہ کر لیہن ہو اور آغا فرہاد رشکِ قمر سے۔"

"اس رات تم کھانا بہت کھا کر سوئی ہو گی۔"

"پر کچھ زمانہ انہوں نے آغا فرہاد کے ساتھ اچھا بتا لیا۔ مساعروں میں دور دور بلائی گیں۔ مبئی گیئں تو تبادت رہین بہوتے آؤ بھگت ہوئی۔ رائیٹر لوگ کے ہاں روز دعوت۔ چاوپاٹی پھولو بیلنچے جگہ جگہ غزلیں سنائیں۔ مساعرے ہوئے۔ ہر جگہ فرہاد صاحب اور رشکِ قمر۔ فرہاد صاحب اور رشکِ قمر دھوم مچا دی۔

جی ہاں۔ اور جب صاحبزادے لکھنؤ واپس آئے تو ڈپٹی ڈپٹیائن نے وہ جوتے کاری کی۔ لگائے پچاس اور گنا ایک۔ اس مہینے باندھ لوندھ کر بیاہ کر دیا۔"

"یہی تو گجب ہوا۔"

"کیا غضب ہوا۔ ماں باپ کی طے کی ہوئی لڑکی سے بیاہ نہ کرتے۔؟"

"ارے تم مرد لوگ ہو بڑے حرامی۔ ہم تو جب جانتے جب فرہاد صاحب ڈنکے کی چوٹ زنسک قمر سے دو بول پڑھوا لیتے۔"

"زیادہ ٹر ٹر نہ کرو۔"

"تم بھی ہمارے ساتھ یہی کرو گے۔ ہمیں مالوم ہے۔ جہاں تمہاری ماتا کہیں گی اسی کنواری کنیا سپتری راجکماری سوبھاگیہ لکشمی کے ساتھ سات پھیرے ڈالو گے۔"

دیکھو صدف۔ ہمارا بھیجا مت کھاؤ۔ جا کر سو رہو۔ بھول گئیں۔ تم کون تھیں کیا سے کیا بنا دیا۔ نامور آرٹسٹ۔ اب اور زیادہ اونچے خواب نہ دیکھو بھائی۔ میلوں ٹھیلوں میں گانے والی موتی کو صدف آراء بیگم میں تبدیل کر دیا۔ پھر بھی چاؤں چاؤں۔"

نام بدلنے سے قسمت تھوڑے بدل جاتی ہے۔ جمیلن کا نام بدلنے سے کیا ان کی ریکھ بدل گئی۔ ویسے ہی پڑی جھینک رہی ہیں کھاٹ پر۔ ہم جات کے ہندو۔ تم نے ہمیں بنایا صدف آراء بیگم۔ جمیلن کو کر دیا جل بالا لہری۔ اس سے کیا فرق پڑا۔ ارے جو بھگوان کے گھر سے لکھوا کر لایا ہے۔ وہی بھوگے گا۔"

"عجیب پاگل عورت ہے۔"

"ارے بھگوان کی بے انصافی کا کوئی ٹھکانہ ہے۔ زنسک قمر کے ہاں چار برس میں دو مٹھو لڑکے۔ اور فرہاد صاحب کے ہاں تین تین بٹیاں۔ بھگوان کا جو کام دیکھو الٹا۔ اتنے زمانے سے سنسار چلاتے چلاتے گڑبڑا گئے ہیں۔ ارے سنو ورما صاحب۔"

"کیا ہے یار۔" ورما صاحب اونگھ رہے تھے۔

"جب نادر پیدا ہوئے ہم نے قمرن کو سمجھایا تھا۔ یہ بڑے ہو جائیں تو آغا صاحب پر دعویٰ کر دینا۔ اتنی بڑی جائیداد کے مالک ہیں۔ کچھ تو مل جائے گا وہ تو بہ تلا کرنے لگیں کہ ایسی بات ہی پھر نہ کہنا۔ اس بے چارے کے مرنے کے بعد فرہاد صاحب نے قمرن کا دو ئی سو روپیہ باندھا۔ یہ بھی الٹی بات۔ اب جون آفتاب پیدا ہوئے تو ان کا چار سو روپیہ مہینہ نہیں کرنے کا چاہی۔"

"ارے چغد۔ آفتاب ان کا لڑکا نہیں ہے۔"

"وہ تو ہم جانتے ہیں۔ قمرن اتنی گھنی ہیں۔ بتاوت نہیں ٗ ل ہم جانتے ہیں۔ وہ جون آرٹسٹ پنجاب سے آیا رہا اوکا ہے۔ آئے بھی وہ گئے بھی وہ۔ ختم فسانہ ہوئے گیا۔ آغا فرہاد تو قمرن سے ملتے جلتے ہیں نہیں۔ بیوی سے ڈرسٹ ہیں۔ ہمدردی میں وظیفہ دیت ہیں۔ تو ہمدردی میں دو سو اور بڑھا دیں۔ ان کے پاس پیسے کی کوئی کمی ہے۔ اور قمرن بے چاری کی حالت بہت خراب ہے۔ اے ورما صاحب۔ سوئے گئیں۔"

ورما صاحب اب خراٹے لے رہے تھے۔ صدف آرا بیگم اٹھ کر رسوئی گھر کی طرف جا رہی تھیں جب کال بیل بجی۔ جا کر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا ایک لمبا تڑنگا خوش شکل گورا چٹا اجنبی نیلا سوٹ پہنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اپنا کارڈ دیا۔ نام بتایا، صدف آرا نے اندر جا کر ورما صاحب کو جگایا۔

"ارے ورما صاحب۔ اٹھو۔ وہ آئے ہیں۔ آغا شب دیگ۔"

"بجیا۔ بہت بن ٹھن کے چلیں ۔ آغا شب دیگ نے بلایا ہے۔"

"جمیلن ۔ تم صدف کی نقل میں جاہلانہ باتیں نہ کرو۔ ہم آغا شب آویز ہمدانی کے ساتھ آن پکچر دیکھنے جا رہے ہیں۔"

"شب آویز نام ہی انوکھا ہے ۔"

"خالص ایرانی نام ہے۔ اور ہمدان سے ان کے باپ کلکتے آن بسے تھے۔"

"شکردان ۔ چاردان ۔ ہمدان ۔ معقول ۔ بس ذرا یہ خیال رکھنا کہ کہیں یہ بھی چونا نہ لگا جائیں ایرانی ہے ۔ حد سے حد متعہ کر کے چھوڑ دے گا ۔"

"کالی زبان ۔ تھو تھو ۔"

"نکاح کرے گا ۔؟"

"ہاں کہہ چکا ہے ۔"

نکاح کے لئے تیار ہے ! جمیلن خوشی کے مارے اُٹھ بیٹھی سرہانے سے کھسک کھسک کر پائنتی آ گئی جہاں قمرن کھڑکی کے پاس کھڑی میک اپ کر رہی تھی ۔

"کل شام کہہ رہے تھے ۔ یہاں سے جاتے ہی خط لکھیں گے ، ٹھیک دو مہینے بعد بلا لیں گے ۔"

"کلکتے ۔ ؟"

نہیں ان کی بزنس کئی جگہ پھیل گئی ہے ۔ کراچی ۔ طہران ۔ لندن ابھی تو کراچی جا رہے ہیں۔"

"درما صاحب ان سے اچھی طرح واقف ہیں ۔؟"

ہ دوراصاحب ہی کے پاس تو آئے تھے اپنی بزنس کے سلسلے میں۔ صدف مجھ سے ریڈیو اسٹیشن پر ملی کہنے لگی ایک آغا کلکتے سے آیا ہے۔ بہت امیر ہے۔ اور چھڑا۔ شائد نکاح کرلے۔ موسیقی کا بہت شوقین ہے۔ بے چاری نے دوسرے روز ہی سونگ برڈز کلب کا پروگرام کیا۔

" بجیا۔ ایک بات کہوں۔ دوراصاحب صدف کی اس عادت سے بہت پریشان ہیں کہ وہ تمہیں سونگ برڈز کے ذریعے لوگوں سے ملواتی ہے۔ سونگ برڈز اسی لئے بدنام ہو رہا ہے۔"

" تو آخر میں کیا کروں۔ مرجاؤں؟" مشاعروں کے دعوت نامے آنے بند ہو گئے۔ ریڈیو پروگراموں سے خرچہ چل سکتا ہے! دو سو ڈپلی فرہاد کے ہاں سے آتے ہیں۔ پچاس روپے مہینہ دوراصاحب فرضی میوزک اسکول کی فرضی وائس پرنسپل کے نام سے تم کو دے رہے ہیں۔ محض از راہ ہمدردی ڈھائی سو میں گزر ہو سکتی ہے۔ ابھی آفتاب کو اسکول میں ڈالنا ہے۔"

" بجیا۔ یہ آغا ہمدانی واقعی تم سے شادی کرنے کو تیار ہے۔"

" کہہ چکا ہے صاف صاف الفاظ میں۔"

لگتا ہے تم اس پر عاشق ہو گئی ہو۔ کم بخت خوبصورت تو بہت ہے۔"

ہاں عاشق تو ہو گئے ہیں۔ آج تک کسی پر عاشق نہیں ہوئے تھے۔ اس پر جان جاتی ہے اور وہ بھی ہمیں بہت چاہتے ہیں۔"

" مگر وہ تمہیں کراچی یا لندن بلاکر شادی کرے گا۔ یہ مجھے یقین نہیں آتا۔"

کالی زبان۔ تھو۔ تھو۔ تھو۔ تو تو میری خوشی دیکھ کر جلتی ہے۔ لنگڑی چڑیل۔ پھپھل پائی۔"

" ازبرائے خدا بجیا۔ ایسی گھٹیا باتیں تو مت کرو۔"

بجیا پرس اٹھا تنتناتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر ٹاٹ کا پردہ اٹھایا۔ اور باہر نکلیں سائیکل رکشا میں بیٹھیں، رکشا پاٹے نالے سے نکل کر کارلٹن ہوٹل کی طرف روانہ ہوئی۔

ادرے بدھاتا۔ بنتی کروں توری۔ اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو۔

ڈھولک کی تھاپ پر صدف آرا اور کماری جل بالا لہری کی سریلی آوازیں۔ اور ایک دلدوز پوربی گیت ۔۔ اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو۔ ارے اگلے جنم۔

سونگ برڈز میوزک اسکول کے کمرے میں ایک لڑکی ٹیپ ریکارڈر چلا رہی تھی۔ صدف اور جمیلن برآمدے میں چٹائی پر بیٹھی تھیں۔ جمیلن کی بیساکھی سامنے دھری تھی۔ صدف تھالی میں ترکاری کاٹ رہی تھیں۔ ورما صاحب باہر گئے ہوئے تھے۔

"آج پندرہ تاریخ ہے۔ قمرن اب تک کراچی پہنچ گئی ہوں گی۔" صدف نے آلو چھیلتے ہوئے کہا۔

"کیا پتہ۔" جمیلن آہستہ سے بولی "کب تک پہنچیں گی۔ ڈھاکا پاسپورٹ سے گئی ہیں۔ کھوکھرا پار کا راستہ سنا ہے بڑا جان جوکھوں کا سفر ہے۔ جوان بیٹی کا ساتھ۔"

"آج کی بات ہے جب ماہ پارا پیدا ہوئی تھی۔ سولہ برس گزر گئے۔" صدف نے کہا۔

" اب کیا وہ بجیا کو پہچانے گا۔ ردپا ہو گئے کیس۔ صدف ہم تو جانتے ہیں بعض گیت ہی منحوس ہوتے ہیں۔ یاد ہے۔ بجیا ہر پروگرام میں وہی ایک راجستھانی مانڈ سنایا کرتی تھیں۔ ساون

بیتو جائے ۔

عالی جاہ بیگی آؤ رے ۔ عالی جاہ بیگی آؤ رے ۔ روپا ملانہ ساجن ملے روپا ہو گئے کیس ۔
عالی جاہ بیگی ۔۔ حرامزادے آلو کے پٹھے کو نہ واپس آنا تھا نہ آیا ۔ ارے ایک خط تک نہ لکھا !

" شروع شروع میں دو چار چٹھیاں تو آئی تھیں ۔" صدف نے کہا ۔

اس کے بعد گول ۔ بجیا نے کتنے خط لکھے ۔ ہر پتے پر ۔ کراچی ۔ طہران ۔ لندن ۔ سترہ برس ڈاکئے کی راہ دیکھتے گذار دیئے ۔ صبح و شام دروازے پر جا کر ڈاک کا انتظار کرتیں ۔ ہم سے بار بار پوچھتیں کوئی ڈاک آئی ۔ کوئی تار آیا ۔ سترہ برس ۔ اتنا بڑا انتظار ۔"

" بہت بڑا انتظار ۔" صدف نے دہرایا ۔

" جب ماہ پارا پیدا ہوئی تھی یاد ہے درما صاحب نے پھٹ سے اس کا کیا نام تجویز کیا تھا ماہ دخت ۔۔ کہ ایرانی کی بیٹی ہے اس کا نام ہے ماہ دخت اور ایک نام امرا پالی رکھا ہے ۔ ایک ایرانی نام رکھو ۔ ایک ہندوستانی اور جب باپ کے پاس جا کر رہے گی انگلینڈ ایک انگلش نام وہاں رکھ لے گی ۔" جمیلن بے پایاں تلخی سے ہنسی ۔" ماہ پارا اپنے اسکول میں لڑکیوں سے کہا کرتی تھی ہمارے ڈیڈی لندن اور کراچی کے بڑے بھاری بزنس مین ہیں ۔"

درما صاحب کوئی تحفہ اس کے لئے خان سے لے کر آتے اسے سمجھا دیتے بٹیا امرا پالی اسکول میں اپنی دوستوں کو بتانا تمہارے ڈیڈی نے لندن سے بھیجا ہے ۔" صدف نے کہا ، اور دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھے ۔

" صدف ۔ بجیا کو ڈھونگی پیروں فقیروں کے چکر میں تم نے ہی ڈالا ۔"

ہم کیا کرتے۔ جمیلن۔ قمرن ماہ پارا کی وجہ سے بالکل خفقانی ہوئی جاتی تھیں۔ ہم سے روز کہتی ماہ پارا بڑی ہوتی جارہی ہے کہیں اسے بھی میری طرح کی زندگی نہ گزارنی پڑے میں چاہتی ہوں اسے کسی نہ کسی طرح اس کے باپ کے سپرد کردوں۔ جمیلن تو خدا ہی کو نہیں مانتیں ان سے کیا کہوں۔ تم کسی پہنچے ہوئے بزرگ کے پاس لے چلو۔ یہ تو اب کی بات ہے جب ماہ پارا تین سال کی تھی۔ تب قمرن ایک شاہ صاحب کے پاس گئی تھیں۔ ہمیں بھی ساتھ لے گئی تھیں۔ ان کی بہت دھوم سنی تھی۔ انہوں نے قمرن سے کہا تمہارے اوپر کسی دشمن نے جادو کر دیا ہے راستے بند کر دیئے ہیں۔ تمہارے بال کہیں پر دفن کئے گئے ہیں۔ تین سو روپے دو قبرستان میں جاکر چالیس دن عمل کریں گے۔ ہم تو یہ سب سن کر ڈر گئے ہم نے قمرن سے کہا واپس چلو۔ ہم تو آ گئے مگر وہ پھر پہنچیں ان کے پاس۔ ان سے مایوس ہوئیں تو دوسرے عاملوں کے پتے ڈھونڈ ڈھونڈ کر خود جانے لگیں۔ کتنا روپیہ برباد کیا۔ تم سے ڈرتی تھیں۔ تمہیں کیا بتائیں ہم نے بہت سمجھایا مگر وہ مانی ہی نہیں۔ بس یہی لگن تھی کہ شب دیگ کا خط آجائے۔ وہ بلالے۔ بلاکر بیاہ کرلے یا ماہ پارا کی ذمے داری سنبھال لے۔ سارے پیر فقیر نجومی رمّال ان کو یہی آس دیا کئے۔ آج سے اکیسویں دن خط آئے گا۔ آج سے ساتویں رات وہ خواب میں آئیں گے۔ آج سے چالیسویں دن خط آدے گا۔ سینچر کو ساڑھ ستی ہے وہ ختم ہوگی تو مراد پوری ہوگی۔ ارے کتنا سینکڑوں ہزاروں روپیہ کھلا دیا ان ٹھگوں کو۔ مگر آس نہ ٹوٹی —"

اس پیر گردی میں بجیا نے اپنے زیور بھی بیچ ڈالے۔ پورا ایک سیٹ بنوالیا تھا جڑاؤ۔ ایک جوڑا کڑے ٹھوس۔ تمہارے ہی ساتھ جاکر تو بنوائے تھے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ کہیں جاتی

ہیں تو گہنے نہیں پہنتیں۔ ہم نے پوچھا تو کہنے لگیں ماہ پارا کے لئے بنک کے لاکر میں رکھ دیئے ہیں۔ اب ان کے پاکستان جانے کے بعد خبریں مل رہی ہیں کہ سارے گہنے بیچ کر ایک ٹھگ پیر فلفل شاہ بلیوں والے کو کھلا دیئے وہ برسوں سے ان کے لئے بہت بلیے بلیے جتن کر رہا تھا۔"

"ایک بات ہے جمیلن۔ انہی فلفل شاہ نے ان کو کراچی جانے کی رائے دی۔"

"کہاں رہتا ہے۔ میرا بس چلے تو جیل بھجوا دوں۔" جمیلن نے کہا۔"

بخشی کے تالاب پر رہتا تھا، اب غائب ہے۔ ہم سے ایک روز قمرن نے آکر بہت خوشی خوشی بتایا کہ فلفل شاہ کہتے ہیں کہ لڑکی کو لے کر پاکستان چلی جاؤ۔ ہم نے اس کا زائچہ بنایا ہے۔ اس کے ستارے بہت تگڑے ہیں۔ کراچی پہنچتے ہی گوہر مراد حاصل ہوگا۔ محبوب کا سر تمہارے قدموں پر ہوگا۔ اب ہم تو یہ کہتے ہیں کہ جمیلن ہو سکتا ہے کراچی میں شب دیگ سے ملاقات ہو جائے۔ اپنی لڑکی کو دیکھ کر ہی انہیں دیا آجائے۔ اور کچھ نہیں تو ماہ پارا کے نصیب ہی اچھے نکلیں ان کا وہاں بیاہ ہو جائے۔ ہم تو دونوں جب سے گئی ہیں روز دعائیں مانگ رہے ہیں۔ کبھی کبھی بھگوان سن بھی لیتے ہیں۔

"اچھا۔ ؟ تم جو اپنے لئے اتنی مدتوں سے مانگ رہی ہو وہ تمہارے بھگوان نے سنی!"

صدف سر جھکائے ترکاری کاٹتی رہی۔

"ورما صاحب نہیں آئے اب تک اب ہم چلیں۔" جمیلن نے اپنی بیساکھی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اپنی پریشانیوں میں گھوم رہے ہیں جب سے ان کے باپ مرے ہیں وہ باپ کی بزنس سنبھالیں کہ سونگ برڈنز کو دیکھیں۔ کل کہہ رہے تھے اس کو بند ہی کر دیں گے۔"

"پھر تم کہاں جاؤ گی۔؟ ان کی ماتاجی تو تمہیں قبول لنے کے لئے اب تک راضی نہیں ہوئیں۔"

"جہاں ہمارے مقدر میں ہوگا جمیلن ہم وہاں جائیں گے۔"

"ہمیں رکشا تک پہنچا دو صدف۔ بجیا اگر کراچی پہنچ گئی ہیں تو وہاں دھکے کھاتی پھر رہی ہوں گی۔ اب ہم گھر جا کر ان کے خط کا انتظار شروع کریں۔

پیاری بجیا تسلیم۔

آپ کو یہاں سے گئے ایک سال ہو گیا۔ خیریت سے پہنچنے کا صرف ایک پوسٹ کارڈ آیا تھا۔ اور اس کے چار مہینے بعد ایک اور پوسٹ کارڈ۔ ہم اور خالہ یہاں فکر سے ادھ موئے ہوئے جا رہے ہیں۔ از برائے خدا سب مفصل حالات لکھئے۔ شاید آپ نے مکان تبدیل کر لیا ہے۔ ہم آپ کو جتنے خط بھیجتے ہیں۔ جواب نہیں آتا۔ صدف بھی کئی خط لکھ چکی ہیں۔ اب یہاں کے حالات سنئے۔ بڑے افسوس سے اطلاع دی جاتی ہے کہ خالو کا پچھلے دنوں بدھ کو انتقال ہو گیا۔ کل مسجد میں سوئم کی قرآن خوانی فاتحہ خوانی بھی کرا دی گئی۔

بجیا دوسری بُری خبر یہ سناتی ہوں کہ تمہارا لڑکا آفتاب ایک روز مجھ جاگتی کی سونے کی دونوں چوڑیاں جو تم نے بنوائی تھیں کلائیوں میں سے نوچ کرلے بھاگا۔ میں جنم کی اپاہج اس کے پیچھے نہ دوڑ سکی۔ خالہ ہائیں ہائیں کرتی رہ گئیں۔ یاد ہے پہلے کہا کرتا تھا زاہد صاحب کے پیٹ میں چھرا گھونپ دوں گا ان کی لڑکیوں کو غنڈوں سے اٹھوا لوں گا۔ اب تمہارے

جانے کے بعد سے دھن سوار تھی کہ بمبئی جاکر ہیرو بنوں گا۔ میری چوڑیاں اڑا کر بمبئی بھاگ گیا۔
اب سنا ہے وہاں چاقو چھری لئے غنڈہ گردی کرتا پھر رہا ہے۔

فرہاد صاحب کی نئی کوٹھی بٹلر پیلس کولونی میں بن کر تیار ہو گئی ہے۔ وہ اس میں اٹھ گئے ہیں ان کی بڑی لڑکی جس کی شادی انگلینڈ میں کسی ڈاکٹر سے ہوئی تھی وہیں پر ہے۔ چھوٹی جو بیاہ کے کراچی گئی تھی شاید تمہاری کبھی اس سے وہاں مڈبھیڑ ہو جائے۔ سنا ہے اس کا شوہر وہاں لکھ پتی کروڑ پتی ہے۔ منجھلی والی لڑکی آجکل لکھنؤ میں ہے۔ اس کے شوہر نے سیتا پور میں بڑے پیمانے پر فارمنگ شروع کر دی ہے۔ فرہاد صاحب نے خالو کے کفن دفن کے لئے پانچ سو روپے بھجوائے تھے جو ملازم پیسے لے کر آیا تھا اس نے یہ سب کچھ بتلایا۔

بجیا تمہیں یاد ہے ماہ پارا کے باپ کے لکھنؤ سے جانے کے چند روز بعد ہم لوگ سب درما صاحب کے ہاں جمع تھے۔ تم نے کہا تھا پتہ نہیں ہماری ماں، خالہ اور ہم دونوں اتنے بدنصیب کیوں پیدا ہوئے۔ تو میں نے تم سے کہا تھا ذرا دنیا کے اصل بدنصیبوں کو دیکھو۔ جنم کے اندھے ڈھائی فٹ کے بونے بونیاں۔ کبڑی لڑکیاں۔ بیٹھ پر یہ بڑے بڑے کوبڑ یا چہرے پر چیچک کے نشان۔ بھینگی۔ کانی۔ ہم ہی کو دیکھ لو۔ کہ اچک اچک کر چلتے ہیں۔ کم از کم تمہاری صورت تو اچھی ہے آواز تو ہے اور دیکھو۔ مردہ شو نیاں جھکا رہیں۔ جیل کاٹنے والی عورتیں فرض کرو تم دنیا میں کسی قتل کے مقدمے میں پھنس جاتیں اور عمر قید ہوتی۔ دنیا میں ہزاروں کیا لاکھوں انسان عمر قید کاٹ رہے ہیں۔ سینکڑوں پھانسی چڑھتے ہیں۔ قتل کئے جاتے ہیں تم اور ہم لاکھوں سے بہتر ہیں۔ اپنے سے بدتر لوگوں پر نظر کرو۔

درما صاحب تال بجا کر بولے۔ شاباش جمیلین THAT IS THE SPIRIT لیکن اب بچیا ہماری اسپرٹ کا بھی کچومر نکلتا جا رہا ہے۔ کہاں تک اور کب تک۔

اسی روز، تم اس کم بخت آغا شب دیگ کی وجہ سے بہت اداس بیٹھی تھیں تو ورما صاحب نے تمہیں CHEER UP کرنے کے لئے چھیڑا تھا کہ زنک قمر تم گو ہر شب چراغ کے لئے ایک افسانہ لکھو۔ افسانہ لکھ رہی ہوں دل بیکرار کا۔ آنکھوں میں رنگ بھر کے ترے انتظار کا۔ تو میں نے چڑ کر کہا تھا افسانہ لکھیں بچیا کے دشمن اور موئی آنکھیں نہ ہوئیں بالٹیاں ہو گئیں۔ بالٹیوں میں رنگ بھر کے ترے انتظار کا۔ سب خوب ہنسے تھے۔ تم بھی ہنس پڑی تھیں۔ پھر ورما صاحب خود ہی کہنے لگے واقعی تم دونوں کی زندگیاں ایسی ہیں کہ کوئی گریک ٹریجڈی کیسی ہوتی ہے۔ تم نے کہا تھا وہی جو ہمارے مقابلے میں پکنک معلوم ہو۔

ورما صاحب بولے "تم لوگ تنہا نہیں ہو۔ ہمارے سماج میں زیادہ تر عورتوں کی زندگیاں ہمیشہ سے ٹریجک رہی ہیں اور انہیں مزید بیوقوف بنانے کے لئے انہیں "ستی ساوتری" وفا کی پتلی ایثار کی دیوی کے خطاب دے دیئے جاتے ہیں۔ اور وہ خوش ہو جاتی ہیں"

"نہایت الو کی پٹھیاں ہیں" میں نے جل کے کہا تھا۔ کہنے لگے۔ لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اس کی ماں روتی ہے کہ جانے کیسا نصیبہ لے کر آتی ہے وداع ہوتی ہے تو ماں پچھاڑیں کھاتی ہے کہ نہ جانے سسرال میں اس پر کیا بیتے گی۔ کبھی تم نے کسی انگریز یا امریکن یا یورپین لڑکی کو دیکھا یا سنا ہے کہ اس کے بیاہ پر خود اور اس کے ماں باپ دھاڑیں مار مار کر روتے ہوں۔ پھر ہماری ہندوستانی عورت بیوہ ہوتی ہے تو دراصل پچھاڑیں اس لئے کھاتی ہے کہ اس کے روٹی کپڑے

کاسہارا ختم ہوا۔"

مگر بھیا۔ ان سب کے دانت دکھانے اور کھانے کے اور ورما صاحب نے ہمیشہ اسی طرح بڑی اونچی اونچی باتیں کیں مگر خود صدف سے بیاہ نہ کیا۔ ایسی وفادار عورت جس نے بیس بائیس برس ان کے پاؤں دھو دھو کر پیے کسی دوسرے پر نظر نہ ڈالی۔ اسے انہوں نے پچھلے دنوں پرانی جوتی کی طرح اتار پھینکا۔

چنانچہ اب ایک بلکہ دو زوردار خبریں بھی سن لو۔ شری زیندر کمار ورما کو ایک دولتمند گجراتن لیڈی ڈاکٹر نے اغوا کر لیا۔ ولایت سے آئی تھی۔ یہ موٹی بھینس کی بھینس ورما صاحب پر خوب ڈورے ڈالے۔ بہت امیر عورت ہے۔ باپ احمد آباد میں مل اونر ہے۔ ورما صاحب کی سونگ برڈ ز انٹر پرائیزیز اب تقریباً ٹھپ ہو چکی ہے۔ اپنا خاندانی بزنس وہ گھاٹے سے چلا رہے تھے۔ گوہر شب چراغ بھی بند ہو گیا۔ اس میں بہت روپیہ اتنے برسوں ڈبویا۔ شاید یہی سب سوچ کر ڈاکٹرنی سے شادی کر لی۔ وہ انہیں رخصت کرا کے احمد آباد آ گئی۔

بھیا تم سوچ سکتی ہو صدف کا کیا حال ہو گا۔ بہت برا حال تھا چھکو پھکو روتی تھی۔ لیکن ورما صاحب نے کچھ روپیہ اس کے نام جمع کر دیا تھا۔ اس نے دو کمروں کا ایک فلیٹ لے لیا۔ اس میں اٹھ گئی۔ یہ کوئی چھ مہینے کی بات ہے۔ مگر اب جو قصہ سنانی ہوں اس پر سر دھنو۔ ابھی چار مہینے ہوئے لکھنؤ میں ہندوستانی لوک سنگیت پر ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی مجھے اور صدف کو بھی مدعو کیا گیا۔ کانفرنس والے مجھے کرسی پر بٹھا کر لے گئے میرے اندر اب گانے کی طاقت تو رہی نہیں۔ بس بیٹھی ٹکر ٹکر سب کے منہ دیکھا کی۔ کانفرنس میں فارن کے لوگ

بھی آئے تھے۔ ایک اردو ہندی داں امریکن بھی تھا۔ بجیا وہ امریکن صدف پر لٹو ہو گیا۔ جتنی دیر انہوں نے گایا وہ بالکل الوؤں کی طرح منہ کھولے ان کو تکتا رہا۔ کانفرنس کے بعد صدف سے بار بار ملا۔ پندرھویں دن ان کو کورٹ میں لے جا کر سول میرج کر لی۔ صدف سے تین چار سال چھوٹا ہی ہوگا۔ یاد ہے، ورما صاحب کہا کرتے تھے ہماری سرن پہ کوئی فرنگی عاشق ہو گیا۔ ہم جا کر اسے قتل کر دیں گے۔ شادی کے تیسرے دن صدف اسے لے کر ہم سے ملانے لائیں۔ کہنے لگیں یہ ہمیں سیڈی کہتے ہیں۔ کہتے ہیں "مس سیڈی تھامپسن" کسی انگریز کے مشہور ناول کی ہیروئن ہے۔ میں نے دل میں سوچا ورما صاحب کو بتانے والی بات ہے۔ وہ فٹافٹ نام تجویز کرنے کے بہت شوقین تھے۔ مگر ورما صاحب اب کہاں۔ احمد آباد میں بیٹھے سسرے کا ہی کھاتہ دیکھ رہے ہوں گے۔

آج پندرہ دن ہوئے ہیں۔ بی صدف اپنے میاں کے ساتھ امریکہ چلی گئیں۔ چلتے وقت ہم سے لپٹ کر اور تمہیں یاد کر کے دھاڑوں روئیں۔ پرسوں ان کا پیرس سے ہمارے نام خط بھی آ گیا۔

کاش بجیا اسی طرح تمہارے دن بھی پھر جائیں۔

ورما صاحب کا میوزک اسکول بند ہونے سے ہماری وہ "پنشن" بھی القط جو بچارے نے اتنے برسوں دی۔ تمہارے جانے کے بعد تو ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ کر دیا تھا۔ فرہاد صاحب سے ہم نے ایک پیسے کی مدد نہ لی۔ بجیا اب چلا پھرا بالکل نہیں جاتا۔ پلنگ پر پڑے پڑے پلاسٹک کی ٹوکریاں سوئیٹر بن کر بیچے۔ اب چکن کاڑھنی شروع کر دی ہے۔ ایک ساڑھی کے دس روپے۔

زیادہ کڑھت ہو تو بیس یا پچیس بہت دیدہ ریزی کا کام ہے۔ مگر آمدنی کا یہی ایک ذریعہ ہے فاقہ کشی کا وہی زمانہ واپس آگیا جو بچپن اور لڑکپن میں تھا۔ واہ ہماری بھی کیا زندگی رہی۔

بجیا اگر تمہارا کام وہاں نہ بنے تو ازبرائے خدا واپس آجا۔ خالہ دعا لکھواتی ہیں۔ ماہ پارا کو بہت بہت پیار۔

تمہاری

جمیل النساء

یہ خط مکتوب الیہ کے پاس نہیں پہنچا کیونکہ انڈو پاک جنگ شروع ہو چکی تھی۔ بھارت اور مغربی پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میری پیاری بہن جمیل النساء

ہزاروں دعائیں۔

میں جب سے یہاں آئی ہوں تم کو کئی خط لکھ چکی ہوں۔ ایک کا جواب نہیں آیا۔ تمہارے اور خالہ خالو اور آفتاب بیٹے کے لئے سخت فکرمند ہوں۔ میں نے تمہیں پہلے بھی لکھا تھا اب پھر تاکید ہے آفتاب کو کسی طرح مار پیٹ کر اسکول بھیجتی رہو۔ ورما صاحب سے کہو اس کی فیس معاف کرادیں اور اسے سمجھائیں کہ وہ پڑھنے میں دل لگائے۔ وہ میرے سامنے ہی حد سے زیادہ آوارہ ہو گیا تھا۔

میں تم کو یہاں کی داستان پوری لکھ چکی ہوں۔ یہ سوچ کر کہ شاید وہ مفصل خط تم کو نہیں ملا از سر نو سارا قصہ بتاتی ہوں۔ مگر تم میری فکر میں کڑھنا نہیں انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کھوکھراپار کے رستے میں ریلی کے ایک غریب مولوی صاحب اور ان کی بڑھیا کا ساتھ ہو گیا تھا جو اپنے بیٹے کے پاس کراچی جا رہے تھے۔ بڑے نیک لوگ تھے مجھ سے کہنے لگے تم عورت ذات، جوان جہان بیٹی کا ساتھ۔ کراچی میں اکیلی کہاں دھکے کھاؤ گی، جب تک کوئی ٹھکانہ نہ بنے ہمارے ساتھ ہی رہو۔ میں نے ان کو یوں بتایا تھا کہ شوہر نے مجھے چھوڑ دیا ہے وہ چھ ماہ کراچی چھ ماہ لندن میں رہتا ہے اور میں نان نفقے کا مطالبہ کرنے پاکستان آئی ہوں۔ یہ سن کر انہیں بہت ہمدردی ہو گئی تھی کیونکہ ان کی لڑکی کو بھی ان کے خاوند نے بے قصور طلاق کہہ کر دھتا بتائی تھی۔ اور وہ ریلی میں پڑی اپنی جان کو رو رہی تھی۔

بہر حال۔ تو میں ان کے ساتھ لالو کھیت پہنچی جو یہاں غریب مہاجروں کی ایک بستی ہے۔ ان کا بیٹا محمد لطیف خان کسی امریکن کے ہاں موٹر ڈرائیور تھا۔ وہ بھی بہت اچھی طرح پیش آیا مگر اس کی بیوی ماہ پارا اور مجھ سے جلنے لگی۔ میں نے لطیف بھائی سے کہا کہ جلد از جلد مجھے کہیں کھانا پکانے کی نوکری ہی دلوا دیں تو میں ان کے گھر سے چلی جاؤں وہ میرے لئے نوکری ڈھونڈنے لگے۔ ہمیں وہاں رہتے ہوئے دس بارہ دن ہوئے تھے۔ کہ ایک روز لطیف بھائی کی دلہن نے میلاد شریف کیا۔ اس میں میں نے نعتیں اور سلام پڑھا تو بہت تعریف ہوئی اور محلے میں گھر گھر میلاد شریف پڑھنے کے لئے بلائی جانے لگی۔ یہ ربیع الاول کا مہینہ تھا۔ اکثر مکانوں میں بیویاں میری حالت پہ ترس کھا کر دو چار روپے بھی دے دیتیں۔ ایک بار پھر وہ ترائی کے گاؤں میں گھومنے کا زمانہ لوٹ آیا۔ کیا اللہ کی شان ہے۔

ایک روز ایک محفل میں میلاد میں درود شریف پڑھا جا رہا تھا کہ باہر ایک موٹر آن کر

رکی اور اس میں سے کچھ غیر ملکی کیمرے سنبھالے اُترے میں سمجھی لطیف بھائی جہاں ملازم ہیں وہ لوگ ہیں، باہر گئی۔ وہ یورپین ٹورسٹ تھے۔ اس وقت عورتیں اندر صحن میں زور زور سے درود شریف پڑھ رہی تھیں ان لوگوں میں سے ایک نے جس کے لمبے لمبے سرخ بال تھے اور نیچے کو جھکی ہوئی مونچھیں۔ مجھے بلا کر انگریزی میں پوچھا "آل محمڈن" کیا ہے۔ پہلے تو میں چکرائی پھر خیال آیا کہ "آل محمد۔ ان کی سمجھ میں ALL MOHAMMADEN آیا ہے۔ توبہ۔ توبہ۔

اتنے میں ماہ پارا باہر آگئی۔ اس نے انگریزی میں سمجھایا کہ ہم لوگوں کی ریلی جس میٹنگ ہو رہی ہے۔ لال مونچھوں والا ماہ پارا کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ مجھ سے پوچھا کیا میری لڑکی ہے میں نے کہا "یس" اجازت چاہی تصویر کھینچ سکتا ہوں۔ "اسٹنگ پرٹیلی بیوٹی" میں نے سر ہلایا اس نے فوراً کئی تصویریں اتار لیں۔ اب ہمارے گرد بھیڑ اکٹھی ہو گئی۔ لال مونچھوں والے نے اپنا کارڈ ماہ پارا کو دیا کہ فلاں ہوٹل میں کل صبح دس بجے آئے وہ اور تصویریں کھینچے گا۔ کسی فارن میگزین کے لئے اور اس کا بہت اچھا معاوضہ دے گا۔ ماہ پارا فوراً راضی ہو گئی۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ لطیف بھائی سے پوچھ لینا ضروری ہے۔ میں نے ماہ پارا سے کہا اس کو کہہ دے کل فون کر کے بتا دے گی کہ آ سکتی ہے یا نہیں۔ چند منٹ بعد وہ لوگ چلے گئے۔ شام کو جب لطیف بھائی گھر آئے میں نے اُن سے ذکر کیا۔ وہ بریلی کے پٹھان آدمی۔ اور مولوی کے بیٹے۔ ایک دم لال پیلے ہو گئے کہنے لگے: "یہ لڑکی کی بربادی کی طرف پہلا قدم ہو گا۔ تمہیں معلوم ہے یہ لوگ فارن رسالوں کے لئے کس قسم کی تصویریں کھینچتے ہیں؟ اگر تم کو اپنی اور ماہ پارا کی عافیت منظور ہے اور یہ بھی چاہتی ہو کہ اپنے خاوند پر نان نفقے کا دعویٰ کر سکو تو شرافت سے رہو۔

میں نے ایک جاپانی کے ہاں آیا گیری کا بندوبست کر دیا ہے وہاں چلی جاؤ۔ وہ لوگ کوارٹر بھی دیں گے۔ لڑکی اپوا کے کسی انڈسٹریل ہوم میں کام سیکھ رہی ہے۔ انگریزی اسکول میں پڑھ چکی ہے۔ کسی نرسری اسکول میں ملازمت مل جائے گی۔ میں کوشش کروں گا۔" میں نے اس شریف انسان کی بات مان لی اور ماہ پارا کو ہوٹل جانے کے لئے سختی سے منع کر دیا۔ مگر وہ صبح سویرے ہی چپکے سے بھاگ گئی اور پھر کبھی لالو کھیت نہ آئی۔

آگے کی داستان بہت لمبی ہے مختصر کرتی ہوں۔ ماہ پارا کو اُسی فائیو اسٹار ہوٹل میں غیر ملکیوں کے ساتھ دیکھا جانے لگا۔ وہ کہاں رہتی تھی اور کیا کرتی تھی کسی کو معلوم نہیں۔ بہت دنوں بعد مجھے جاپانیوں کے ہاں فون کیا جہاں مجھے لطیف بھائی نے آیا کی نوکری دلا دی تھی۔ میں نے اپنا نام مونا رکھ لیا۔ کوئی پرانا شناسا دیکھ بھی لے تو مونا آیا کو بھلا کیا پہچانے گا۔ میں نے آغا شب آویز ہمدانی کی تلاش جاری رکھی۔ جگہ جگہ فون کئے۔ معلوم ہوا کہ وہ اب مستقلاً لندن میں رہتے ہیں۔ تو پھر وہاں خط لکھے۔ اور حسب معمول جواب کا انتظار شروع کیا۔ اور حسبِ معمول محروم رہی۔ ایک روز ماہ پارا نے بہت مضطرب آواز میں فون کیا کہ فلاں ہوٹل میں کوئی آغا ہمدانی طہران سے آکر ٹھہرے ہیں میں تو ان سے ملنے نہیں جاؤں گی تم ہو آؤ۔ شاید ڈیڈی ہوں۔ میں نے فوراً اپنی جاپانی بیبم سے چھٹی لی۔ برسوں بعد سنگھار پٹار کر کے اچھی ساری پہن کر دھڑکتے دل سے اس ہوٹل پہنچی۔ ریسپشن کاؤنٹر پر آغا ہمدانی کے کمرے کا نمبر دریافت کیا۔ میرے حواس باختہ ہو رہے تھے۔ رنگ فق تھا۔ کاؤنٹر کی لڑکیوں نے مجھے تعجب سے دیکھا۔ اتفاق سے اسی وقت آغا ہمدانی آ گئے۔ وہ شب آویز کے بجائے ایک پچیس چھبیس سالہ نوجوان تھا۔ اب مجھے اتنی انگریزی نہ

آئے نہ انہیں اتنی اردو بہر حال میں نے ان سے پوچھا آغا شب آویز ہمدانی کو جانتے ہیں کیسے ہیں ؟ گفت بلبلے ۔ بالے ۔ خوبے ۔ خوبے لندن میں رہتے ہیں ۔ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بتایا ان کی خانم اور میری خالہ شیراز میں ایک ہی دانش گاہ میں جو تھیں ۔ یک پسر دارد ۔ وہی نا ؟

پھر آغا ہمدانی تو ایران ایر کی کوچ کی طرف بڑھ گئے ۔ میں نے ماہ پارا کا فون آنے کے بعد شب آویز کے نام جو کھرا لکھا تھا وہ پرس سے نکالا پرزے پرزے کرکے وہیں ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا ۔ اور ہوٹل سے باہر آگئی ۔ اب سکون ہے ۔ اب کسی چیز کا انتظار نہیں ۔ لیکن اب ماہ پارا کی فکر کھائے جا رہی ہے وہ مجھ سے بالکل برگشتہ ہو چکی ہے کسی کو یہ بھی نہیں بتاتی کہ میں اس کی ماں ہوں ۔ کہتی ہے میں ایک آیا کو اپنی ماں کیسے بتاؤں ۔ میرے پاس آکر کیوں نہیں رہتیں ۔ کیوں ڈھائی سو روپے مہینے پر نوکرانی بنی اپنی اوقات کھو رہی ہو ۔ میرے پاس پیسے کی کمی نہیں ۔ لیکن ماہ پارا کے ہاں دولت کی یہی فراوانی مجھے مارے ڈال رہی ہے ۔ وہ ایک مشتبہ قسم کے ہوٹل میں رہتی ہے اور طرح طرح کے مشتبہ لوگوں سے اس کی دوستی ہے ۔ کبھی کہتی ہے اپنے ایک عرب فرینڈ کے ساتھ بیروت جا رہی ہے کبھی فون کرتی ہے کہ کیبرے ڈانس سیکھنے ہانگ کانگ جانے والی ہے ۔ ہفتوں ہفتوں غائب رہنے کے بعد صورت دکھاتی ہے تو لگتا ہے کوئی امریکن فلم اسٹار آگئی ۔ بڑھیا ولائتی کپڑے ، قیمتی عطر ۔ نت نئے ہیر اسٹائل اور وگ ۔ بے چارے بھائی لطیف جو درما صاحب کی طرح نیک دل آدمی ہیں ۔ مجھ سے بے حد ناراض ہیں ۔ کبھی ملتے بھی نہیں ۔ اور میں کیا منہ لے کر ان کے گھر والوں سے ملنے لالوکھیت جاؤں ۔ ان سب کو ماہ پارا کے متعلق معلوم ہو چکا ہے میں ماہ پارا سے ایک پیسہ نہیں لیتی مگر وہ تو یہی سمجھتے ہوں گے ۔

اب جبکہ آغا شب آویز کی طرف سے بھی مکمل ناامیدی ہو چکی ہے۔ مجھے ماہ پارا کے ساتھ رہنے میں کیا عار ہے۔ میری سمجھ میں خود نہیں آتا۔ کیا اماں، ہرمزی خالہ، اور میں ساری عمر رہی نہیں کیا کیے جواب ماہ پارا نہایت اعلیٰ پیمانے پر بڑے اسٹائل سے کر رہی ہے۔ میری جاپانی میم جیسے مجھ سے بے حد ہمدردی ہے مجھے بتایا کرتی ہے کہ ٹوکیو میں ایک پورا علاقہ بے حد شاندار گینزا ڈسٹرکٹ کہلاتا ہے۔ جس میں جاپان کی ہزاروں ہزار لڑکی اپنی اشغال میں مصروف ہے اور پرانے فیشن کی باوقار گیشا گرلز کی جگہ لے چکی ہیں۔

ٹھیک ہے۔ پھر مجھے ماہ پارا سے پیسے لیتے کیوں جھجک آتی ہے۔ شاید اس لئے کہ ہم لوگوں نے عزت اور وقار کا ایک پردہ اپنے سامنے آویزاں کر رکھا ہے گویا وہ پردہ ٹاٹ کا تھا اور ٹٹی دھوکے کی۔ وہ دھوکہ ہم اپنے آپ کو بھی دیتے تھے اور دوسروں کو بھی۔ اور وہ کیا انوکھی وضعداری تھی۔ حالانکہ تمہیں معلوم ہے ایران میں "خانگی" طوائف ہی کو کہتے ہیں۔ اب ایک علی الاعلان "ہائی کلاس پارٹی گرل" کی کمائی کھاتے مجھے شرم آتی ہے۔ کس قدر کی غیر منطقی اور بے تکی بات ہے۔ اور ماہ پارا کی طرف سے تشویش بڑھتی جا رہی ہے۔ ہماری وہ تنگ و تاریک گلیاں محفوظ تھیں۔ اور انسان اتنے درندے نہیں تھے۔ آج یہ باہر کی کھلی فضائیں اور جگمگاتی دولت مند موڈرن دنیا بے حد پُر خطر ہے اور انسان زیادہ کمینے ہو چکے ہیں۔

بہرکیف، میں اپنی قسمت پر پیچ و تاب کھاتی ہوں اور شاید قسمت ہی سے انتقام لینے کی خاطر ماہ پارا سے کسی قسم کی مدد نہیں لیتی۔

ایک روز اتفاقیہ آغا فرہاد کی چھوٹی لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔ میری جاپانی میم اپنی کسی امریکن

سیسل سے ملنے گئی تھیں۔ میں بھی ساتھ تھی۔ پڑوس کی عالی شان سہ منزلہ عمارت کے پھاٹک پر آغا فرہاد کے چھوٹے داماد کے نام کا بورڈ لگا تھا۔ میری میم صاحب امریکنوں سے ملنے ان کے ہاں گئیں میں باہر دھوپ میں ٹہلتے ٹہلتے پڑوس کے پھاٹک میں داخل ہو گئی۔ کوٹھی تھی کہ محل کا محل۔ جیسے امریکن رسالوں میں تصویریں ہوتی ہیں۔ برآمدے میں پہنچی۔ سنگِ مرمر کا فرش۔ اندر جھانکا۔ سفید "وال ٹو وال" کارپٹ نہایت بڑھیا۔ فرنیچر۔ آغا فرہاد کی لڑکی سامنے ہی نظر پڑی میں فوراً پہچان گئی۔ کئی بار لکھنؤ میں دیکھا تھا وہ سفید رنگ کے ٹیلی فون پر جھکی "چین ڈیل" "چین ڈیل" کر رہی تھی۔ "جی ہاں۔ ہم نے سیکنڈ فلور کے لئے کوین این فرنیچر چاہیئے۔ جی ہاں ہم نے سارا سامان یورپ سے منگوایا ہے۔" پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ درشتی سے پوچھا کیا ہے؟ کیا چاہیئے میں نے کہا "کچھ نہیں بیگم صاحب آپ کی آیا سے ملنے آئی تھی۔" اس نے جواب دیا "اُدھر جاؤ۔ اندر کہاں گھسی آتی ہو۔" میں برآمدے سے اتر ٹہلتی ہوئی پھاٹک سے باہر آ گئی۔

میری جاپانی میم بہت اچھی عورت ہے اس نے کہا ہے یہ خط اپنی ماں کو ٹوکیو بھیج دے گی۔ اس کی ماں اسے تمہارے پتے انڈیا ری ڈائریکٹ کر دے گی۔

خالہ خالو کو دست بدست آداب۔ ورما صاحب اور صدف کو سلام آفتاب بیٹے کو پیار۔ تمہیں پیار۔

جمیلن دعا کرو ماہ پارا راہ راست پر آ جائے۔ اب سنا ہے۔ وہ اسمگلروں کے ایک گروہ میں شامل ہو گئی ہے۔ خدا کرے یہ خبر غلط ہو۔ میں تو دعائیں مانگتے مانگتے بھی تھک کے چور ہو گئی۔

تمہاری ــــ بجیا

یہ خط بھی مکتوب الیہ کے پاس نہیں پہنچا۔ کیونکہ جاپانی میم نے اسے اپنی ماماسان کو ٹوکیو بھیجا۔ اور اس جاپانی ضعیفہ نے دوسری ڈاک کے ساتھ اپنی میز کی دراز میں رکھ دیا اور اسے انڈیا پوسٹ کرنا بھول گئی۔

پاکستان کے اردو اخباروں کی ایک سُرخی۔

"کلفٹن پر نوعمر حسینہ کا پُراسرار قتل، قاتل مفرور ہیں۔ لڑکی کی لاش صبح چار بجے کے قریب ساحل پر پڑی پائی گئی۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ یہ لڑکی غالباً اسمگلروں کے ایک بین الاقوامی گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی ماں ایک غیر ملکی کے ہاں گھریلو ملازمہ ہے۔ تحقیقات کے بعد جس وقت اس عورت کو لڑکی کی لاش شناخت کرنے کے لئے بلوایا گیا وہ ہسٹریائی انداز میں چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔ درما صاحب آپ کی امرا پالی مرگئی۔ درما صاحب آپ کی امرا پالی کو مار ڈالا۔ اس وجہ سے یہ شبہ بھی ظاہر کیا جارہا ہے کہ یہ دونوں ماں بیٹیاں بھارتی جاسوس تھیں۔ تحقیق تفتیش جاری ہے۔"

پولیس کے مردہ گھر کا ایک منظر۔

"متوفیہ کے باپ کا نام۔؟" پولیس افسر پوچھتا ہے۔

"باپ کا نام۔؟ قدرتِ خدا لکھ لیجئے۔"

"عجیب نام ہے۔"

"ہر نام عجیب ہوتا ہے۔"

"قدرتِ خدا۔ بنگال معلوم ہوتا ہے۔"

"جی ہاں متوطن کلکتہ۔ اس جہانِ فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔"

"کیا قومیت تھی؟"

"برٹش۔"

"مقتول کا پاسپورٹ نمبر؟"

"صفر۔ صفر۔ صفر۔"

"ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔"

"لاش کا پاسپورٹ؟ صفر۔ صفر۔ صفر۔ صفر۔"

"کیا اب پھر دورہ پڑنے والا ہے؟"

"لاش کا پاسپورٹ۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ سفر ہے۔ دشوار۔ بہت بڑی منزل عدم ہے۔ ہا۔ ہا نسیم جاگو کمر کو باندھو۔ اٹھاؤ بستر۔ اجی اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے۔" عورت اب گانا شروع کر دیتی ہے۔ پولیس کے لوگ اسے تعجب سے دیکھتے ہیں۔ "جوانی حسن، جاہ و دولت۔ یہ چند انفاس کے ہیں جھگڑے۔ اجل ہے ایستادہ دست بستہ۔ نوید رخصت ہر ایک دم ہے۔ لسان دست سوال سائل ہتی ہوں ہر ایک مدعا سے۔ تہی ہوں ہر ایک مدعا سے۔ عورت اب گراموفون ریکارڈ پر اٹکی ہوئی سوئی کی طرح بے تکان دہرا رہی تھی۔ "سفر ہے دشوار۔ سفر ہے دشوار۔ سفر ہے دشوار۔ بہت بڑی منزل عدم۔ عدم۔ عدم۔ جی چھاپ تلک سب چھینی موسے نینا لگائے کے۔ چھاپ تلک۔ خسرو نظام کے بل بل جاؤں۔ بل بل جاؤں۔ بل بل بل بل بل بل بل۔" اس نے پھرکی کے مانند

گھومنا شروع کر دیا۔ اس کا جوڑا کھل گیا اور بالا بنے بل شانوں پر بکھر گئے۔ اب وہ زبان نکال کر لٹو کی طرح گھومنے لگی۔ جیسے زندگی کے مرگھٹ پر کالی رقصاں ہو۔

دو سپاہی اسے بدقت پکڑ کر باہر ایمبولنس کی طرف لے گئے۔

نورِ سلام مسافر خانہ، محمد علی روڈ: بمبئی کے کلرک نے پوچھا "پاکستانی"؟

"پتہ نہیں پاکستانی کہ ہندوستانی۔ یہ دراصل جہنمی"۔

کلرک نے نو وارد عورت کو تعجب سے دیکھا۔

"آپ نے مجھے پاکستانی کیوں سمجھا۔ کیا میرے ماتھے پر لکھا ہے؟"

"جی نہیں بیگم صاحبہ۔ آپ چاروں طرف ایسے شبہے کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے بعض پاکستانی جو پہلی بار یہاں آتے ہیں ہر چیز کو شک کی نظروں سے ۔ ۔ ۔ "

میں ساری دنیا کو شبہے کی نظروں سے دیکھتی ہوں۔ کیا پتہ آپ بھی ابھی مجھے جاسوس سمجھ کر حوالات میں بند کر دیں۔ دیوانی قرار دے کر پاگل خانے بھیج دیں۔ میری پیٹھ میں چھرا گھونپ کر میری لاش ساحل پر پھینک دیں۔ میرا زیور لوٹ کھائیں۔ مجھے فریب میں مبتلا رکھیں۔ میرے منہ پر کالک پوت دیں۔ میں ہزاروں خط لکھوں ایک کا جواب نہ دیں"۔

کلرک گھبرا کر منیجر کو بلانے کے لئے اُٹھا۔

"گھبرائیے نہیں۔ اب میں بالکل اچھی ہوں۔ یہ میڈیکل سرٹیفکیٹ دیکھ لیجئے" اس نے پرس کھولا، پھر اسے بند کر دیا۔ اور کہا "میں ایک فون کر سکتی ہوں؟"

"ضرور" کلرک نے کہا۔

عورت ٹیلی فون ڈائریکٹری میں نمبر تلاش کرنے لگی۔ چند منٹ بعد اس نے ایک نمبر ڈائل کیا۔

ہلو۔ ہلو۔ یہ شیخ صاحب ہیں۔

"جی میں حاضر ہوں۔ فرمایئے۔ کون صاحب"

"میں رشک قمر بات کر رہی ہوں"

"اوہو۔ رشکِ قمر صاحبہ۔ یہ عید کا چاند کہاں سے نکل آیا۔ سنا ہے آپ تو کراچی چلی گئی تھیں۔"

"جی ہاں۔ ابھی آج صبح دس بجے ہی وہاں سے واپس ہوں۔"

پچیس برس قبل جب وہ آغا فرہاد کے ساتھ بمبئی آئی تھی۔ شیخ صاحب کے ہاں کئی محفلیں رہی تھیں۔ شیخ صاحب بھی اس زمانے میں افسانے لکھتے تھے اب عرصے سے ادب سے تائب ہو چکے تھے اور اب لوہے کے بڑے بھاری بیوپاری تھے مگر کہا ہے لگا ہے اب بھی ادبی محفلیں منعقد کرتے تھے اور مشاعروں وغیرہ کی سرپرستی فرماتے تھے۔ "تو فرمایئے کب ملیں گی۔؟" انہوں نے پوچھا۔ "اتفاق سے غریب خانے پر کل ہی ایک نشست ہے۔ آپ کا قیام کہاں ہے؟"

"نور اسلام مسافر خانہ۔"

"اوہ۔"

اگر وہ ادیب لئے شیرٹن یا تاج میں ٹھہری ہوتی تو شیخ صاحب کہتے میں خود کار لے کر آپ کو لینے آؤں گا۔ اب انہوں نے ذرا سرد مہری سے جواب دیا۔ "اچھا۔ تو کل آپ سات ساڑھے سات تک آجایئے۔ میں ورلی سی فیس پر رہتا ہوں۔ آپ کو بس آسانی سے مل جائے گی۔ میرا

پتہ لکھ لیجئے ۔"

دوسری شام وہ مسافر خانے کے کلرک سے بسوں کے نمبر دریافت کرکے بس اسٹاپ پر جا کھڑی ہوئی۔ بہت لمبا کیو تھا۔ آدھ گھنٹہ بعد وہ ایک غلط بس پر چڑھ گئی وہ بمبئی کے راستوں سے نابلد تھی غلط بس اسٹاپ اُتر گئی۔ دوسری بس میں سوار ہوئی اس نے ورلی ناکے پر اتار دیا۔ اس وقت تک وہ تھک کر چور ہو چکی تھی۔ تازہ دم ہونے کے لئے سمندر کی دیوار پر بیٹھ گئی۔ سامنے ایک ٹاپو پر حاجی علیؒ کی خوبصورت سفید درگاہ بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ جمعرات کی شام تھی اور لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ پانی میں بنے ہوئے طویل پختہ راستے پر سے گزرتے درگاہ کی سمت جا رہے تھے۔ اس نے دور ہی سے فاتحہ پڑھی اور ایک راہگیر سے ورلی سی مینشن کا راستہ پوچھ کر پیدل چلنا شروع کیا۔

کچھ دیر بعد ایک عالی شان عمارت کے سامنے پہنچی۔ شیخ صاحب کا بڑھیا فلیٹ پانچویں منزل پر تھا۔ ڈرائنگ روم میں محفل ناؤ نوش گرم تھی۔ رشک قمر اپنے کھچڑی بالوں معمولی ساری، الجھی ہوئی شخصیت کی وجہ سے کوئی اسکول ٹیچر معلوم ہو رہی تھی بلکہ ان میں سے ایک نے تو پوچھ بھی لیا۔" کیا آپ انجمن اسلام کے کسی گرلز اسکول میں پڑھاتی ہیں ؟" صاحب خانہ اور ان کی الٹرا فیشن ایبل بیگم نے بھی کسی خاص گرمجوشی کا اظہار نہ کیا اور ایک دو غزلیں سن کر مہمانوں نے بھی رسمی واہ واہ کے بعد نظر انداز کر دیا۔

رات کے دس بج چکے تھے لوگ ڈنر کے لئے اُٹھے۔ اس وقت ایک صاحب اس سے باتیں کرنے لگے۔ وہ دل ہی دل میں ان کی بہت ممنون ہوئی۔ وہ پلیٹیں لے کر اس کے ساتھ

سمندر کے رُخ ایک دریچے میں آ بیٹھے۔ وہ خان صاحب خان صاحب کہلا رہے تھے۔ اور نہایت معقول اور بھلے آدمی معلوم ہوتے تھے کھانا ختم کرکے وہ جلد ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور صاحب خانہ سے اجازت چاہی "مجھے اپنے کام کے سلسلے میں ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ایک جگہ پہنچنا ہے۔ میں کولابہ میں رہتا ہوں۔ آپ کہاں جائیں گی؟" انہوں نے رشکِ قمر سے دریافت کیا۔

"محمد علی روڈ۔"

"مجھے بھی ساؤتھ بومبے جانا ہے۔ لیکن راستے میں مجھے ذرا سا کام ہے اس کے بعد آپ کو پہنچا دوں گا۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"

وہ نیچے آکر خاں صاحب کی کار میں بیٹھی۔ خان صاحب نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "قمر صاحبہ۔ میں امپریساریو ہوں ARTISTES میں DEAL کرتا ہوں کہ آپ محض رسمی قسم کی شاعرہ نہیں ہیں پرفورمنگ آرٹسٹ ہیں۔ یا رہ چکی ہیں۔ اور اس وقت کسی وجہ سے بیحد پریشان ہیں کیا میں آپ کی کسی طرح سے مدد کر سکتا ہوں؟"

"آپ نے شاید سنا ہو۔ میں ایک زمانے میں ریڈیو پر گایا کرتی تھی۔

خان صاحب نے کار چلاتے چلاتے چٹکی بجائی "ویری ٹو آر۔ میرا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں اپنی پریشانی کی وجہ بتلا دیں۔ یو سی۔ مسز قمر۔ میری جوالائن ہے اس میں میں نے آرٹسٹوں کی دکھی زندگیوں کے اتنے واقعات دیکھے ہیں کہ میرے اندر۔ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ اب ایک قسم کی وسعت نظر آ گئی ہے اور جس طرح انسان انسان کو ستاتا ہے۔

اس کی کمینگی اور ذلالت پر اب میں متحیر نہیں ہوتا۔"

"نہیں۔ میرے حالات تو ٹھیک ہیں صرف سفر کی تکان ہے۔"

"خوددار عورت ہے۔" خاں صاحب نے دل میں سوچا۔ خاموشی سے راستہ طے کرنے لگے۔ میرین ڈرائیو پر سے گزرتے ہوئے انہوں نے گھڑی دیکھی اور کہا "آیئے کہیں چل کر کافی پی لیں۔ وہ چپ رہی۔ وہ اوبیرائے شیرٹن پہنچے۔

ریسٹوران میں جاکر کافی کا آرڈر دیا اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔ شریف اور دردمند آدمی ہے۔ ورما کی طرح۔ رشکِ قمر نے سوچا پھر خود ہی بتانا شروع کیا ساتھ ساتھ کہانی کو حسبِ ضرورت ایڈٹ کرتی گئی۔ لیکن جہاندیدہ خاں صاحب کب کے سمجھ چکے تھے۔

"میرے شوہر مجھے چھوڑ کر لندن چلے گئے تھے۔ میں اپنی لڑکی کو لے کر کراچی گئی۔ وہاں اس کی۔ اس کی شادی کر دی۔ اب واپس آگئی ہوں۔"

"اب کیا ارادہ ہے۔"

"پتہ نہیں لکھنؤ جاکر سوچوں گی۔"

"آپ قوالی گانا پسند کریں گی۔؟ عورتوں کی قوالی۔ آپ نے سنا ہوگا۔ جیسے شکیلہ بانو بھوپالی۔ نورجہاں۔ رضیہ بانو۔ دراصل میں جلد ہی ایک پارٹی کو اگلے مہینے فارن ٹور پر بھیج رہا ہوں شکیلہ بانو اور نورجہاں تو انگلینڈ کا دورہ کر آئی ہیں۔ آپ؟"

جی نہیں۔"

انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ "آیئے چلیں۔ سامنے ہی جانا ہے۔"

وہ ہوٹل سے نکل کر زسیمان پوائنٹ کے ایک عالی شان تھیٹر ہال پر پہنچے۔ جہاں "مجرا کیبرے کمپنی قسن" کا پروگرام شروع ہو چکا تھا وہ اندر گئے۔ اسٹیج پر ایک لڑکی سنہرا وگ پہنے انتہائی بیہودہ رقص کر رہی تھی۔ ہال میں بدمعاش قسم کے لوگ اور چند سیلرز اور چند عرب بیٹھے ہوئے تھے۔

ژسک قمر نے گھبرا کر کہا۔" خاں صاحب۔ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

" میں نے آپ سے عرض کیا تھا نہ میں IMPRESSARIO ہوں۔ مجھے معلوم ہوا کہ ایک نئی رقاصہ شہزادو بہت TALENTED ہے اسی کو دیکھنے آیا ہوں۔ ممکن ہے اگر اچھی نکلی تو اسے اپنی POOL میں ڈال دیں گے۔"

اب وہ بہت دیر بعد زیر لب مسکرائی۔ اسے وِرما صاحب اور ان کا سونگ برڈز کلب یاد آ گیا۔ مگر ورما صاحب کلچر کے شوقیہ خادم تھے اور ان کا دائرہ بہت محدود تھا۔ خاں صاحب ہندوستان کی بے حد ترقی یافتہ انٹرٹینمنٹ انڈسٹری کے ایک گھاگ کاروباری تھے۔

شہزادو نے اسٹیج پر آ کر بہت ہی چیپچڑ بیلی ڈانس شروع کر دیا۔

" باندرے کی کوئی چھوکری ہے۔ اسے ڈانس کی الف بے بھی نہیں آتی۔ خاں صاحب نے کہا۔ " اور لوگ اتنے بڑے بڑے ٹکٹ خرید کر اسے دیکھنے آئے ہیں۔"

" جی ہاں زیادہ تر انڈر ورلڈ کے لوگ۔ اسمگلر۔ اور گلف کے عرب۔ آیئے چلیں۔" وہ اُٹھ کر باہر آئے۔ باہر اچانک بارش شروع ہو چکی تھی اور سمندر کی اونچی لہریں دیوار سے ٹکرا رہی تھیں۔ تیز ہوا چل رہی تھی اور سڑک پر سناٹا تھا۔ برساتی میں ایک آدمی اوورکوٹ میں چہرہ چھپائے چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس نے ژسک قمر سے فرنچ میں کچھ کہا وہ گھبرا کر خاں صاحب کے برابر

دبک گئی۔

"بمبئی کی انڈر ورلڈ بہت خطرناک ہے۔ آیئے چلیں۔ خان صاحب نے کہا۔

"موسیو۔ مادام۔" اس آدمی نے بے بسی سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔ "میں مارشس سے آیا ہوں۔ ایک آدمی نے میری جیب کاٹ لی۔"

خان صاحب اور زُنسک قمر سرعت سے کار میں جا بیٹھے۔ سامنے ایک نامی گرامی اسمگلر کی کیڈی لیک آکر رُکی۔ وہ اپنے گرگوں کے ساتھ جھومتا جھامتا اترا۔ خان صاحب نے اپنی کار اسٹارٹ کی۔ "بمبئی کی انڈر ورلڈ۔" انہوں نے دہرایا۔

خان صاحب۔ میری بچی کو۔ کراچی کی انڈر ورلڈ والوں نے مار ڈالا۔ اس نے کہا اور رونے لگی۔

خان صاحب نے کار کی رفتار دھیمی کی اور نرمی سے بولے۔ "مجھے پورا واقعہ بتلا دو زُنسک قمر۔"

تب اس نے پوری داستان ان کو مختصراً بتائی۔ پھر سپاہی مجھے اسپتال لے گئے اور جاپانی صاحب کو اطلاع کی۔ اس بے چارے نے مجھے مینٹل ہوم میں داخل کرا دیا۔ مجھے الیکٹرک شوک لگائے گئے۔ چار پانچ مہینے علاج ہوا۔ جاپانی نے سارا خرچہ اٹھایا۔ وہ ٹوکیو لوٹنے والے تھے مجھ سے کہا۔ مجھے کسی اور جاپانی یا امریکن کے ہاں نوکر رکھوا دیں گے۔ تب ہی میرے پاس مسقط سے پوسٹ کیا ہوا جسلین کا چار سطروں کا پرچہ پہنچا کہ وہ بہت سخت بیمار ہے اور اس کی دیکھ بھال اور مالی اعانت کے لئے کوئی موجود نہیں۔ میں رات بھر دن بھر روتی رہتی۔ جاپانیوں نے میری یہ حالت دیکھ کر اور اس خط کی بنیاد پر میرے لئے پروانہ راہداری کی تگ و دو کی۔ اس میں ایک سال لگ گیا۔ یہ ۷۴ء ہے۔ اجازت ملتے ہی انہوں نے میرے لئے جہاز کا ٹکٹ

خریدار رپورٹ پر مجھے خود پہنچانے آئے میرا رواں رواں ان جاپانی میاں بی بی کو دعائیں دیتا ہے

"روانگی سے ایک دن قبل میں ماہ پارا کو خدا حافظ کہنے اس کے قبرستان تک گئی تھی۔ بہت دیر تک اس کی کچی قبر کے سرہانے بیٹھی رہی۔ اچانک بہت گہما گہمی شروع ہو گئی۔ کسی وی آئی پی کا جنازہ لایا جا رہا تھا۔ ٹیلی وژن کیمرے۔ پریس رپورٹر۔ پھولوں کی بڑی بڑی ٹوکریاں۔ سیاہ ربنوں والے ریتھ۔ سفید شفون اور جارجٹ کی ساڑھیاں سفید سینڈلز سفید پرس سنبھالے سیاہ چشمے لگائے ہلکا میک اپ کئے نفاست سے سر ڈھانپے سوگوار بیگمات۔ میں بس اسٹاپ کی طرف جانے کے لئے اٹھی۔ رستے میں جنازے کے جلوس میں آئی ہوئی شاندار امپورٹڈ کاروں کی اتنی طویل قطار تھی کہ میں ان کے گذرنے کے انتظار میں سڑک کے کنارے ایک سنگِ میل پر بیٹھ گئی۔ ایک کار میں سے ایک سفید شفون کی ساری اور سیاہ چشمے والی بیگم اتریں۔ مجھے کوئی بھکارن سمجھ کر میرے سامنے چند سکے پھینکے۔ بلجیم کی لیس کے سفید نازک رومال سے اپنی ناک کی لو چھوتی آگے بڑھ گئیں۔"

"ڈسکس قمر۔ تم نے ابھی بتلایا تھا تمہارا ایک لڑکا بھی ہے۔"

"جی ہاں۔ اسے اسکول میں پڑھانے کی لاکھ کوشش کی لیکن وہ لکھنؤ کی گلیوں میں آوارہ گردی کا شوقین تھا۔ اب کراچی میں کسی لکھنؤ سے آنے والے نے بتایا تھا کہ وہ بمبئی آ کر داداگیری کر رہا ہے۔ میں کل صبح سے جب سے یہاں پہنچی ہوں۔ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہوں شاید وہ کہیں نظر آ جائے۔ مگر ایسے اتفاقات صرف ہندوستانی فلموں میں ہوتے ہیں۔"

کار اب نورالاسلام مسافر خانے پہنچ چکی تھی۔ خاں صاحب نے آہستہ سے کہا۔ اب پاکستان

سے کچھ روپیہ ساتھ نہ لاسکی ہوں گی۔"

"ایک پیسہ نہیں ۔میرے ہاتھ میں یہ دو سونے کی چوڑیاں ہیں۔ کل انہیں فروخت کرکے لکھنؤ کا ٹکٹ خریدوں گی۔ مسافر خانے کا کرایہ بہت سستا ہے صرف تین روپیہ۔"

خان صاحب کا ہاتھ ان کے کوٹ کی جیب کی طرف گیا ۔" میں اگلے ہفتے اجمیر کے قوالوں کی ایک پارٹی کو لے کر مڈل ایسٹ اور انگلینڈ کے دورے پر جارہا ہوں۔ اسکی وجہ سے بہت زیادہ اخراجات درپیش ہیں۔ انہوں نے جیب سے بٹوہ نکالا۔

رکھسکے ڈبل۔ کھسکے ڈبل۔ کھسکے ڈبل ٹنکب قرعرف قمرن عرف میلے والی امرتی نے دل میں دہرانا شروع کیا۔

خاں صاحب نے کہا:" اس وقت صرف اتنا ہی پیش کرسکتا ہوں ایک مخلص دوست کی طرف سے قبول کیجئے۔ اور بٹوے میں سے ڈیڑھ سو کے نوٹ نکالے۔

ٹپرس کی مسجد میں عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ جس وقت وہ ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اپنے آنگن میں داخل ہوئی ۔ سامنے امرود کی ایک ٹہنی سے سائیکل رکشا کے پرانے ٹیوب اور ٹائر لٹکے نظر آئے۔ باورچی خانے کے آگے تین چار بچے کھیل رہے تھے ۔ ایک عورت نے کھپریل میں سے آواز دی۔ کوہے ۔؟"

اپنا اسباب ڈیوڑھی میں رکھ کر وہ جمیلن جمیلن ۔ پکارتی اپنے کمرے کی طرف دوڑی۔ جلدی میں دہلیز سے ٹھوکر لگی۔ انگوٹھے میں سخت چوٹ آئی۔ اندر اسٹول پر رکھی لالٹین اندھی اندھی جل رہی تھی۔

"جمیلن ۔ خالہ۔ ہم آگئے۔"

بے حد بوڑھی ، سوکھی لنفاط ہرمزی خالہ میلے کچیلے بستر پر سے دھوئیں کی پتلی لکیر کی طرح اٹھیں۔ ان

کے برابر بچھا۔ جمیلن کا پلنگ خالی پڑا تھا۔ اس کی بیساکھی کمرے کے ایک کونے میں رکھی تھی۔ رشکِ قمر کا دل دھک سے رہ گیا۔

"خالہ۔ تسلیم۔" وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر خالہ سے لپٹ گئی۔

"جیو۔ ہزاری عمر جیو۔"

"خالہ۔ جمیلن۔ کہاں ہے؟"

عورت باورچی خانہ سے نکل کر آئی۔ اپنے بچوں کے ساتھ مل کر رشکِ قمر کا اسباب ڈیوڑھی سے اٹھایا اسے لا کر برآمدے میں چن دیا۔ خود دوپٹے سے پسینہ پونچھ کر دہلیز میں آ کھڑی ہوئی اور گھر کی نو وارد مالکن کو دیکھنے لگی۔

"خالہ۔ جمیلن۔" رشکِ قمر نے دہل کر دہرایا۔

"اللہ کے گھر گئی۔" بتولن خالہ نے روتے روتے جواب دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بے کار ہو گئے تھے۔ مولا نے مشکل آسان کی۔"

"جمیلن بٹیا تو بالکل ہل جل نہیں سکتی تھیں بیزداگرد۔ بلا کر لائے وہ بولا سارے بدن کو یہ ہو گیا ہے۔ گٹھیا ہو گئی ہے جوڑ جوڑ جکڑ گیا ہے۔" دروازے میں کھڑی عورت نے کہا۔ رشکِ قمر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"آخر وقت تک اس نے تمہارے خط کا انتظار کیا۔ اسے تو مرے اب ایک سال ہو جائے گا۔" خالہ بولیں۔

رشکِ قمر گم صم باری باری ان دونوں کی صورتیں دیکھا کی۔ ایک آنسو آنکھ سے نہ ٹپکا۔

اس نے جذبات سے عاری سپاٹ آواز میں پوچھا "خالہ۔ تم نے ہمیں اطلاع بھی نہ بھیجی۔"

راستے بند تھے بیٹا۔ خط کس طرح بھیجتے۔ ہمارا کون سگا۔ ولایت میں بیٹھا ہے جس کے ذریعہ خط وکتابت کرتے۔"

رشکِ قمر سر جھکائے کچھ دیر تک خاموش بیٹھی جمیلن کے خالی کھرے پلنگ کو تکتی رہی۔ تعجب کی بات ہے۔ جمیلن کی موت کی خبر پہ میری آنکھوں سے ایک آنسو نہیں گرا۔ کیا ماہ پارا کی وفات، نہیں قتل، پر آنسوؤں کا سارا اسٹاک ختم ہو گیا۔ میں روئی نہیں تو جیوں گی کیسے۔

اچانک اسے جمّن خالو یاد آئے۔ شاید ابھی نماز پڑھ کر مسجد سے نہیں لوٹے۔

"خالہ۔ خالو کیسے ہیں؟"

"کون۔ خالو۔ ان کو مرے سال ہو گئے۔ جمیلن مرحومہ نے تمہیں خط میں اطلاع دی تھی۔"

"مجھے کوئی خط نہیں ملا خالہ۔ کوئی خط نہیں ملا۔ کہیں سے کوئی خط نہیں آیا میرے نام۔"

ہرمزی خالہ۔ جمّن خالو۔ رشکِ قمر لکھنوی۔ جمیل النساء عرف کماری جل بالا لہری۔ ماہ پارا خانم۔ ہم سب ایک دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ پھنسے ہوئے تھے۔ دلدل میں پھنسا آدمی باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ روتا نہیں اسے رونے کی فرصت نہیں ہوتی وہ دلدل سے نکلنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ جمّن خالو۔ جمیل النساء ماہ پارا خانم تینوں دلدل میں دھنس گئے۔ اس نے اپنی خشک آنکھوں پر انگلیاں پھیریں۔

"جمیلن۔ کب۔ کیسے مری۔ خالہ؟"

"آدمی کیسے مرتا ہے بیٹا؟ بس مر جاتا ہے۔ جمیلن نے رات کے وقت دم توڑ دیا۔ تاریخ اور

مہینہ ہمیں یاد نہیں ۔ بھری برسات تھی ۔ گھر میں کفن دفن کے لئے ایک پیسہ نہیں تھا ۔ بفاتی کہیں سے دس روپے قرض لایا ۔ کہنے لگا ۔ محلے والوں سے چندہ کرلوں ۔“

”بفاتی کون ؟“

”رکشا والا جسے جمیلن نے کرائے دار رکھ لیا تھا ۔ جب سے وہ پلنگ سے لگی گلنے کے لئے باہر نہیں جا سکتی تھی ورما صاحب اور صدف آرا امداد کرتے رہتے تھے ۔ ورما شادی کرکے لکھنؤ سے ناپید ہوگئے ۔ صدف کسی گورے کے ساتھ ولایت چلی گئی ۔ اب ہمارا کون ہے ۔ بفاتی نے کہا مسجد میں جاکر چندہ جمع کروں ۔ ہمارا دل نہ مانا ۔ آنکھوں پہ ٹھیکری رکھ کر اسے آغا فرہاد کے ہاں بھجوا دیا ۔ بارش کہیے کہ آج برس کے پھر نہ برسوں گی ۔ فرہاد میاں خود بیمار پڑے تھے ۔ انہوں نے اپنے منشی کے ہاتھ پیسے بھجوا دیئے سب کفن دفن کا انتظام اس نے کیا ۔ موسلا دھار بارش میں لے جاکر بیچاری کی مٹی عزیز کی ۔“

”اب گذر کیسے ہوتی ہے خالہ ؟“

” جمیلن مرحومہ پڑے پڑے چکن کاڑھ کر پچاس ساٹھ روپے مہینہ پیدا کرلیتی تھی ۔ پندرہ روپے مہینہ بفاتی کرایہ دیتا ہے ۔ اب جمیلن کے مرنے کے بعد سے دو وقت دال بھات بھی وہی کھلا دیتا ہے ۔ اس کو خود رکشا کھینچتے کھینچتے ٹی بی ہوگئی ہے ۔ پھر بھی پوری نہیں پڑتی ۔ سات بچے دو میاں بیوی اب بے چارے مجھے بھی سال بھر سے کھلا رہے ہیں شکر ہے تم یہ مکان خرید گئی تھیں ورنہ اس کا کرایہ کہاں سے ادا ہوتا ۔“ دفعتاً اُن کو ماہ پارا یاد آگئی پوچھا ” اے قمرن ۔ بٹیا کہاں ہیں ۔ وہ ساتھ نہیں آئیں ۔ ؟“

"ماہ پارا کی کراچی میں شادی کردی ہے خالہ۔ بہت اچھا لڑکا مل گیا نیک۔ شریف، تعلیم یافتہ اچھی تنخواہ پاتا ہے۔" رشکِ قمر نے کرخت آواز میں جواب دیا۔

"شکر ہے۔ مولا تیرا شکر ہے۔ الٰہی تیرا لاکھ شکر ہے۔" وہ پلنگ سے اٹھنے لگیں۔

"کہاں جارہی ہو۔؟"

"جب ماہ پارا پیدا ہوئی تھی تب سے چودہ رکعت نماز مان رکھی ہے کہ اس کی شادی ہو جائے جب تم کراچی جانے لگیں اسے ساتھ لے کر تب چودہ رکعت اور مانیں کہ وہاں اس کا بیاہ ہو جائے۔"

"تو اب کہاں جارہی ہو؟"

"وضو کرنے۔"

خالہ۔ لیٹ جاؤ۔ کل پڑھ لینا۔" اس نے ہرمزی بیگم کو پھر بستر پر لٹا دیا۔ وہ دفورِ مسرت سے اٹھ بیٹھیں، رشکِ قمر نے ان کا دھیان بٹانے کے لئے پوچھا "تم کہہ رہی تھیں آغا فرہاد بیمار پڑے ہیں۔"

"ارے انہیں کوئی جان لیوا مرض لگ گیا ہے۔ بے چاروں کو بڑے داماد کے پاس علاج کے لئے ولایت گئے ہیں بڑا داماد وہاں ڈاکٹر ہے۔ بیوی اور منجھلی بیٹی داماد بھی ساتھ گئے ہیں۔ چلتے وقت دو سو روپیہ بھجوا گئے تھے اور تمہارے نام ایک لفافہ تھا۔ ابھی دیتے ہیں ذرا لالٹین اٹھانا۔ ہرمزی خالہ نے پھر اٹھنا چاہا۔

"خالہ مجھے بتاؤ میں ڈھونڈ لوں گی۔"

"وہ بکسا کھینچو۔"

قمرن نے جمیلن کی چارپائی کے نیچے سے ٹین کا پھولدار پرانا بکس کھینچ کر باہر نکالا۔ اس میں جمیلن کے کپڑے رکھے تھے۔ وہ آغا فرہاد کا لفافہ ڈھونڈنے کے لئے کپڑے نکال نکال کر فرش پر رکھتی گئی۔ ٹرنک کی تہہ میں پرانا اخبار بچھا تھا۔ اس کے نیچے سے گلابی پلاسٹک کے دو کلپ نکلے جو اس نے مدتیں گذریں پیر جھنڈے شاہ کے میلے میں چار آنے کے اپنے اور جمیلن کے لئے خریدے تھے۔ ان کو کچھ دیر تک تکتی رہی، خالہ کی آواز پر چونک اٹھی۔ اب وہ کہہ رہی تھی ”آفتاب بھی غائب ہو گیا۔ مبیٔ بھاگ گیا۔

زنگ قمرنے پھر آغا فرہاد کا لفافہ تلاش کرنا شروع کیا وہ اسے جمیلن کے ایک آدھ بنے سویٹر کے نیچے رکھا ملا۔ بہت بھاری تھا۔ قمرن کے دل میں روشنی سی پیدا ہوئی شاید نوٹوں کی گڈی بھجوا گئے ہوں۔ جلدی سے جمیلن کی کھاٹ پر آکر بیٹھی۔ اسٹول کھینچ کر قریب رکھا۔ لالٹین کی بتی اونچی کی۔ لرزتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ ایک مراکو لیدر کی نفیس بیاض برآمد ہوئی۔ اور ایک خط پڑھنا شروع کیا۔

زنگ قمر

ہم جمیل النساء مرحومہ کی تعزیت تم سے کن الفاظ میں کریں۔ ہمیں تمہارا کراچی کا پتہ معلوم نہیں ورنہ وہاں خط بھیجتے۔ چاہے تم جواب نہ دیتیں۔ ہماری ترک ملاقات کو پچیس سال گزر گئے لیکن ہم تمہیں بھولے نہیں جو تمہاری ہماری قسمتوں میں لکھا تھا سو پورا ہوا۔ تمہیں لکھنؤ سے گئے بھی پانچ چھ برس ہونے کو آئے۔ تمہارے جانے کے بعد ہم نے جمیل النساء کی کئی بار مالی امداد کرنا چاہی انہوں نے ہمیشہ روپے واپس کر دیئے۔ اس قدر غیور لڑکی ہم نے آج تک نہیں دیکھی۔ ساری

عمر زندگی سے لڑتی رہی۔ پھر موت سے لڑائی۔ آخر میں دونوں سے ہار گئی۔ اللہ تعالیٰ اسے دوسری دنیا ہی میں آرام اور چین نصیب کرے۔

رشکِ قمر۔ پچھلے چند برسوں میں تم ہمیں بے طرح یاد آئیں۔ اب ہم بھی بڈھے ہو چلے۔ بیوی اپنے بیگمے کی سیاست میں مشغول رہتی ہیں۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ اللہ نے ہمیں گھر بار اولاد، دولت آسائش سب کچھ دیا۔ دل کا چین نہ دیا۔ ہم نے تمہارے لئے بہت غزلیں کہیں سب ایک بیاض میں لکھتے گئے اس امید پر کہ شائد کبھی تمہارے ہاتھ میں پہنچ جائے۔ شائد تم کبھی لکھنو لوٹ آؤ۔ پبلک کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے اگر تم واپس آؤ اور مشاعروں میں مدعو کی جاؤ۔ اب سوسائٹی زیادہ وسیع النظر بھی ہو گئی ہے۔ تو یہ غزلیں تمہارے کام آئیں گی۔

اور کیا لکھیں رشکِ قمر ہمیں ڈاکٹروں نے سرطان کا خدشہ ظاہر کیا ہے ہم اپنے بڑے داماد کے پاس لبغرض علاج لندن جا رہے ہیں۔ اب کیا اچھے ہوں گے۔ اور کیا زندہ واپس آئیں گے۔ رشکِ قمر اب خدا حافظ اگر ممکن ہو تو ہمیں معاف کر دینا۔

تمہارا آغا فرہاد

بمبئی والے خان صاحب کے دیئے ہوئے ڈیڑھ سو روپے میں سے اب صرف پانچ روپے باقی تھے۔ رشکِ قمر صبح کو پرانی عادت کے مطابق دس بجے کے قریب ڈاکیئے کے انتظار میں ڈیوڑھی میں جا کھڑی ہوئی۔ چند منٹ بعد اسے اچانک خیال آیا۔ میں بھی کتنی بڑی اُلّو کی پٹھی ہوں۔ اٹھارہ انیس برس لندن کے خط کا انتظار کیا۔ پانچ برس کراچی میں جمیلن کے خط کی راہ دیکھی۔ اب کاہے کا انتظار ہے۔ اب تو سب طرف سے ہمیشہ کے لئے چھٹی۔

وہ آنگن میں واپس آئی۔ بغاتی کی بیوی باورچی خانے میں کھانا پکارہی تھی۔ بغاتی صبح صبح کاڑھا چائے اور ایک سخت لکڑ توڑ پاؤ کا ناشتہ کر کے رکشہ پر دن کی روزی کمانے باہر جاچکے تھے۔ بچے گلی میں کھیل رہے تھے۔ خالہ اندر پلنگ پر پڑی کھانس رہی تھیں۔ رشک قمر پھر دالان میں آکر بیٹھی اور سوچنے لگی اب کیا کروں۔ آغا فرہاد کی بیاض یاد آئی۔ اندر سے اسے نکال کر لائی۔ اس کے ورق پلٹے۔ ہر غزل کے مقطع میں قمر تخلص موجود تھا۔ کچھ دیر تک سوچا کی۔ پھر اُٹھ کر کپڑے بدلنے کے لئے کمرے میں چلی گئی۔

بغاتی دوپہر کو کھانا کھانے ہانپتے کانپتے گھر لوٹے۔ رشک قمر نے بغاتی سے کھانے کے بعد پوچھا۔ بغاتی ہمیں ذرا منصور نگر تک لے جاؤ گے ؟"

"ضرور بٹیا چلیے۔"

وہ باہر آکر رکشہ میں بیٹھی۔ وکٹوریہ اسٹریٹ، فرنگی محل، چوک، اکبری دروازہ، غلام حسین کا پل۔ محرم آنے والا تھا۔ بہت چہل پہل تھی۔ وکٹوریہ اسٹریٹ پر ہزاروں روپے کی لاگت سے تعزیے تیار کئے جارہے تھے۔ غلام حسین کے پل پر بیش قیمت کارچوب کے چار یاری جھنڈے بنائے جا رہے تھے۔

"لگتا ہے اس سال بھی شیعہ سنی سر پھٹول ہوگا۔" بغاتی نے رکشہ چلاتے چلاتے اظہار خیال کیا۔

"اب بھی ہوتا ہے۔؟"

ہر سال۔ اور بہت زوروں میں۔ ابھی تین چار سال ادھر کی بات ہے بٹیا۔ ایران سے کچھ لوگ آئے تھے اپنے ٹیلی وژن کے لئے لکھنؤ کے محرم کی پکچر بنانے یہاں پہنچے۔ یہاں ہو رہی تھی زبردست جنگ شیعہ سنی کی۔ اُلٹے پاؤں واپس گئے۔"

منصور نگر پہنچ کر وہ ایک پرانے مکان کے سامنے اتری۔ بیٹھک کے دروازے پر پہنچی اندر دریا صاحب اور آغا فرہاد کے ایک شاعر دوست اپنے حوالی موالی کے ساتھ موجود تھے۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔

"اوہو۔ بی رشک قمر۔ آپ کب تشریف لائیں۔" وغیرہ وغیرہ۔ چائے اور ناشتہ منگوایا گیا۔ رشکِ قمر نے ریل سے اترنے کے بعد اس وقت تک پیٹ بھر کھانا نہ کھایا تھا۔ دل چاہ رہا تھا سامنے رکھی ساری نعمتیں چٹ کر جائے۔ باتوں باتوں میں پوچھا۔ آج کل کہاں کہاں مشاعرے ہو رہے ہیں۔"

"پرسوں اتوار ہے نا، پرسوں شام ہی ایک مشاعرہ ہے۔ قیصر باغ کی بارہ دری میں آپ آئیں گی؟"

"آپ بلائیں گے تو ضرور آئیں گے۔"

"بات یہ ہے کہ اب ہم تو اس کی انتظامیہ کمیٹی سے الگ ہو گئے ہیں۔ ہمارے چھوٹے بھائی صاحب اس کے سیکرٹری سے کہہ دیں گے۔ ارے میاں"!

ایک صاحب تولیہ سے منہ پونچھتے اندر سے نکلے۔ جھک کر رشکِ قمر کو تسلیمات عرض کی۔

"میاں بی رشکِ قمر صاحب کو اپنے مشاعرے میں بلوالو۔ تم تو بچے تھے۔ ہمیں ان کا پڑھنے کا انداز اور آواز اب تک یاد ہے۔"

"بہت اچھا بھائی جان۔ ہم انتظام کر دیں گے۔"

"کس وقت سے شروع ہے مشاعرہ۔" رشکِ قمر نے دریافت کیا۔

"آٹھ بجے، آپ فکر نہ کیجئے۔ ہم آدمی بھیج کر آپ کو بلوا لیں۔ کار بھیج دیں گے۔"

اتوار کو صبح سویرے سے اس نے مشاعرے کی تیاریاں شروع کیں۔ ٹرنک کھول کر ساریاں

دھوپ میں ڈالیں۔ بلاؤز پر استری کی۔ بال سیاہ رنگے سہ پہر کو آغا فرہاد کی بیاض نکال کر دو تین غزلیں منتخب کیں، ان کے ترنم کی دھنیں بناتی رہی۔ حفیظن سے کہا کھانا سات بجے تک تیار کر دے۔ رشکِ قمر نے عرصہ قبل مکان میں بجلی منگوائی تھی جو اس کے جانے کے بعد ادبار کے دنوں میں بل ادا نہ ہونے کی وجہ سے کاٹ دی گئی تھی سورج ڈھلنے سے پہلے پہلے اس نے آنگن میں بیٹھ کر میک اَپ کیا۔ کراچی میں خریدی ہوئی امریکن نائیلون کی ایک پھولدار نیلی ساری باندھی، جلدی جلدی کھانا کھایا اور طاہر میاں کے کارکن کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ آٹھ بجے۔ ساڑھے آٹھ۔ نو۔ دس۔ گیارہ، ساڑھے گیارہ، اسے مشاعرے میں بلانے کے لئے کوئی نہ آیا۔

صبح سویرے اُٹھ کر اس نے بفاتی کو آواز دی۔ وہ رکشہ کے ٹائر میں ہوا بھر رہے تھے۔

"بفاتی" اس نے ان کے قریب جا کر کہا: "جمیلن مرحومہ کس کارخانے کے لئے چکن کاڑھتی تھیں۔ جانتے ہو؟"

"جی ہاں جانتے ہیں بٹیا۔"

وہ باہر آ کر ایک ٹوٹے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ حفیظن نے کاڑھا چائے کی پیالی پیش کی۔ یہ درباصاحب والی چینٹ کی آرٹسٹک پیالی تھی۔ اس نے چونک کر پوچھا۔ "یہ کہاں سے آئی؟"

"صدف بٹیا چلتے وقت اپنے برتن بھانڈے دے گئیں تھیں سب بک گئے۔ یہی پیالی باقی بچی ہے۔" حفیظن نے کہا۔

صدف بٹیا اور ان کا امریکن خاوند جاتے وقت پیسے بھی دے گئے تھے وہ مہینے بھر کے اندر جمیلن بٹیا اور خالہ کے علاج میں اُڑ گئے۔ بفاتی سر اٹھا کے بولے: "امریکہ جاتے وقت صدف آرا

تو بنک میں ان کا کچھ روپیہ تھا۔ وہ بھی جمیلن بٹیا کے نام کرنے والی تھیں۔ بٹیلن نے ان کو بہت سمجھایا کہ یہ حماقت نہ کریں، کل کلاں انہیں لکھنؤ واپس آنا پڑا تو ضرورت ہوگی۔ وہ نہ مانیں مگر عین وقت پر گاؤں سے ان کے لٹھ بند باپ بھائی آن پہنچے کہ اس روپے پر ہمارا حق ہے۔"

"صدف بیس پچیس دن کے اندر اندر یہاں سے چلی ہی گئیں چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ ورنہ بیٹے کے لئے کچھ انتظام کر جاتیں۔ پھر بھی انہوں نے بہت کیا۔ چلتے چلتے کہہ گئیں کہ امریکہ سے روپیہ بھیجیں گی۔ ۔مگر جمیلن بٹیا ہی نہ رہیں۔" حنیظن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ رشکِ قمر اسی طرح دل کڑا کئے۔ بیٹھی سنا کی۔

"پھر بٹیا کی بیماری کی خبر سن کر آغا فرہاد نے اپنے آدمی کے ہاتھ پیسے بھجوائے وہ انہوں نے لوٹا دیئے۔ دوسری بار پھر ان کا سکتر پیسے لایا۔"

آغا فرہاد کے ہاں اب سکتر بھی ہے؟" رشکِ قمر نے پوچھا۔

"پورا عملہ ہے۔" لغاتی نے اپنی نئی نویلی سائیکل رکشہ کو صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔ لاکھوں کا کاروبار ہے۔ شاہجہاں پور میں غالیچے بنانے کا کارخانہ تو ان کا برسوں کا چل رہا ہے۔ ستیاپور میں فارم لیا ہے۔ جائیداد کا کرایہ الگ آتا ہے۔ یہ بڑی جنگی کوٹھی بنوائی ہے۔ مگر خدا کی شان۔ اتنی دولت اور نام چلانے کے لئے لڑکا ایک نہیں۔ سب کچھ دامادوں کو ملے گا۔"

رشکِ قمر۔ چہرہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اسی مکان میں آغا فرہاد کا فرزند تولد ہوا تھا اور رورما صاحب نے فوراً اس کا نام نادر فردین رکھ دیا تھا۔ وہ دو سال کا ہو کر جاتا رہا۔ آج پچیس برس کا کڑیل جوان ہوتا۔ لیکن اگر زندہ رہتا تو بھی کیا ہوتا۔ کچھ بھی نہیں۔ آفتاب بھی تو زندہ ہے۔

میری بدقسمتی ناقابلِ یقین ہے۔

حفیظن بالٹی اٹھا کر نل پر چلی گئی۔ رشکِ قمر نے جمیلن کے خالی پلنگ پر نظر ڈالی جمیل النساءُ تمہیں تمہاری خودداری نے ہلاک کیا۔ جمیلن کو آغا فرہاد سے تب سے نفرت ہو گئی تھی جب اس نے نادر فردین کی ولادت کے چند روز بعد سوئمنگ برڈز کلب میں فرہاد کو ورما صاحب سے یہ کہتے سن لیا تھا کہ اس طبقے کی چھوکریوں کے پاس بلیک میل کا یہ سہل ترین نسخہ ہے کسی آئے گئے کی اولاد کسی مالدار شناسا کے سر منڈھ دی۔ قمرن کے پاس ثبوت کیا ہے؟" آغا فرہاد کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور وہ اپنی تیز مزاج رئیس زادی دہیشٹ بیوی سے بہت ڈرتے تھے اور سماج کے "LOWEST OF THE LOW" سے ان کی ہمدردی ہوا ہو چکی تھی۔ لیکن نادر فردین کے مرنے کے بعد سے وہ اپنے اس رویے پر بے حد نادم تھے۔ رشکِ قمر سے ملنا جلنا چھوڑ چکے تھے مگر دو سو روپے ماہولد "پنشن" مقرر کر دی تھی جو اس نے بھاگتے بھوت کی لنگوٹی بھلی سمجھ کر شکریے کے ساتھ قبول کی تھی۔ وہ علی الاعلان قدیم ترین "پروفیشن" میں شامل نہیں تھی۔ خانگیوں کے طور طریقے سے گزر بسر کرتی تھی لیکن زمانے کی اونچ نیچ سے بخوبی واقف ہو چکی تھی اور اسے یہ "پنشن" لینے میں کوئی عار نہ تھا، لیکن بلا کی ذہین اور اپاہج جمیلن اس پروفیشن میں کبھی داخل ہی نہ ہوئی تھی اور پلنگ پر پڑی پڑی اپنے صاف و شفاف ذہن سے دنیا کو آرپار دیکھا کرتی تھی، آغا فرہاد کے ان جملوں کو اس نے کبھی معاف نہ کیا۔

"پھر کیا ہوا لبقاتی؟" رشکِ قمر نے پوچھا۔

"فرہاد میاں نے تیسری بار روپے بھجوائے تو ہم نے چپکے سے لے کر رکھ لئے کہ ان کے لئے

اچھا ڈاکٹر بلوائیں گے۔ اچھا کھانا پکوایا کریں گے۔ گھر کی حالت سدھرے گی۔ پوچھے گی کہہ دیں گے لاٹری نکل آئی ہے یا کسی سے قرض لیا ہے۔ مگر ہمارے ایک بچے نے ان کو بھولے سے بتا دیا بہت بگڑیں چلائیں۔ ہم نے ہاتھ جوڑ کر کہا بیٹا ہم آپ کو فاقے کرتے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے نہیں دیکھ سکتے۔ ہماری رکشہ ٹوٹ گئی تھی۔ انہوں نے ہمارے بچوں کی قسم دے کر ہم سے کہا "اس رقم سے نئی رکشا خرید لو۔ ہم تو مرنے ہی والے ہیں تمہیں رکشہ کے ذریعے اپنے کنبے کا پیٹ بھرنا ہے۔" مجبوراً ہم نے یہ رکشہ خریدی۔ جو پیسے بچے اس سے بٹیا نے ہمارے بچوں کے کپڑے بنوا دیئے ارے وہ عورت تھیں کہ فرشتہ۔ جب تک چل پھر سکتی تھیں گانے کا ایک آدھ پروگرام مل جاتا تھا۔ پلنگ سے لگ گئیں تو چکن کاڑھنے لگیں۔ اس میں بیس روپے کما لیتی تھیں۔ بٹیا بھوک سے مریں۔ ہم جو دال بھات کھلاتے تھے۔ وہی انہیں کھلاتے تھے۔ ہمیں معلوم ہے وہ بھوکی رہتی تھیں کہتی تھیں اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر ہمیں نہ کھلائیں۔ دو نوالے کھا کر ہاتھ کھینچ لیتیں، کہتیں ہمارا ہاضمہ خراب ہے۔ لالٹین کی روشنی میں چکن کاڑھتے کاڑھتے سو جاتیں۔"

رشکِ قمر پتھر بنی بیٹھی سنتی رہی۔ لفاتی رکشہ کو جھاڑ پونچھ کر چلنے کے لئے تیار ہوئے۔

یہ رکشہ خرید کر ہم آغا فرہاد کو بتا آئے تھے کہ بٹیا نے پیسے اب بھی نہیں لئے ہم کو دیدیئے۔

"لفاتی جیلن کے ٹھیکیدار سے ہمارے لئے بھی کام لا دو۔"

"بٹیا آپ ریڈیو پر گائیے۔ پہلے تو گاتی تھیں۔"

"اب ہماری آواز ریڈیو کے لائق نہیں رہی۔ ہم یہاں تھے جب ہی بہت عرصے سے گانا چھوڑ چکے تھے۔ چکن بنانے کا ریٹ آجکل کیا ہے؟"

"ہمیں آجکل کا ریٹ تو معلوم نہیں چند سال قبل کُرتوں کی تُرپائی فی کُرتا دس پیسے، ایک ساری کے پانچ دس یا پندرہ روپے۔ بھاری کام کے بیس پچیس، ایک نیا پیسہ فی مری پتی۔ ایک آنہ فی پھول پکی کڑھائی ایک پتی میں جالی بنانے کا ایک نیا پیسہ، ایک نیا پیسہ فی شیڈو ورک ایک نیا پیسہ فی بوٹی۔ ایک عورت ایک ساری نہیں بنا پاتی۔ ایک گھر میں مری پتی بنے گی، دوسرے میں شیڈو ورک، تیسرے میں بیل، جمیلن بٹیا مری پتی بناتی تھیں۔"

دوسرے روز صبح ساڑھے نو بجے ٹھیکیدار چار کُرتے، ایک سفید ساری اور سفید دھاگہ لے کر ڈیوڑھی پر آیا۔ قمرن نے ٹاٹ کے پردے کے نیچے سے ہاتھ بڑھا کر سارا سامان لیا۔ ٹھیکیدار نے دھاگہ ناپ کر دیا کہ عورت دو تین گز اپنے پاس نہ رکھ لے۔ پھر وہ اپنا بنڈل سنبھال کر پڑوس کے مکان کی طرف بڑھ گیا۔

قمرن کھپریل میں آئی۔ بوسیدہ تخت کو جھاڑن سے خوب اچھی طرح صاف کیا۔ اس پر چادر بچھائی اور ساری اپنے سامنے پھیلا کر اس پر چھپے ہوئے بیل بوٹوں کو غور سے دیکھا۔ سوئی میں دھاگہ پرویا دیوار کے سہارے بیٹھ کر ساری کا آنچل گھٹنوں پر پھیلایا اور بوٹا کاڑھنا شروع کیا۔

تب وہ دفعتاً اپنا سر گھٹنوں پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

❖

روشنی کی رفتار

ڈاکٹر (مس) پدما میری ابراہیم کُرین + عمر ۲۹ سال + تعلیم: ایم۔ایس۔سی (مدراس) پی۔ ایچ۔ڈی (کولمبیا) + قد: پانچ فٹ ۲ انچ + رنگت: گندمی + آنکھیں: سیاہ + بال: سیاہ + شناخت کا نشان: بائیں کنپٹی پر بھورا تل + وطن: کوچین (ریاست کیرالہ) + مادری زبان: ملیالم + آبائی مذہب سیرین چرچ آف مالابار + ذاتی عقائد: کچھ نہیں + پیشہ: سرکاری ملازمت۔

...

امریکہ سے لوٹنے کے بعد ڈاکٹر کُرین پچھلے دو سال سے جنوبی ہند کے ایک "سپیس ریسرچ سنٹر" میں کام کر رہی تھی۔ اسے سرکاری کالونی میں ایک مختصر سا بنگلہ ملا ہوا تھا۔ جس میں وہ اپنے دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ مقیم تھی۔ دونوں بھائی کالج میں پڑھ رہے تھے۔ والدین پنشن یافتہ سکول ٹیچر، کوچین میں رہتے تھے۔ پدما میری ایک خاموش طبع محنتی لڑکی تھی جو بڑی لگن سے اپنے

فرائض منصبی انجام دیتی تھی۔ مہینے میں ایک آدھ بار سینما دیکھ آتی تھی۔ اور اوقاتِ فرصت میں دوستوں کو چینی کھانے پکا کر کھلانا اس کا مرغوب مشغلہ تھا۔ ایک سیکنڈ ہینڈ کار خریدنے کے لئے روپیہ جمع کر رہی تھی اور سائیکل پر دفتر آتی جاتی تھی۔ ایک بالکل نارمل قسم کی سیدھی سادھی ساؤتھ انڈین لڑکی۔

اپریل ۱۹۶۶ء کے ایک خوشگوار دن۔ لیبوریٹری میں کام کرتے کرتے پدملنے گھڑی پر نظر ڈالی صبح وہ جلدی میں ناشتے کئے بغیر آگئی تھی۔ اور اب اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ ایک بجنے والا تھا۔ چند منٹ بعد وہ بیگ اٹھا کر باہر آئی۔ سائیکل پر بیٹھی اور اپنے کاٹیج کی سمت روانہ ہوئی۔

راستے میں ایک جگہ ایک ٹیلہ سا تالہ اور پرانا پل تھا۔ دوسری طرف سبزہ اور گھنا جنگل حامی سنسان سڑک تھی۔ اس وقت پل پر سے گزرتے وقت اس کی نظر گھاس کے میدان پر پڑی تو اسے بڑا اچنبھا ہوا۔ ایک چھوٹا سا بیضوی روکٹ گھاس پر کھڑا عجیب سی روشنی میں دمک رہا تھا۔ وہ سائیکل سے اتری اور نرسلوں میں سے گزرتی اس کے قریب پہنچی۔ چاروں طرف سے بغور دیکھا۔ ایک دروازہ اندر دو سیٹیں، خلاباز غائب، دروازے پر جونہی ہاتھ رکھا وہ آپ سے آپ کھل گیا۔ ڈاکٹر گرین خود سپیس ریسرچ میں مصروف تھی۔ بڑے شوق سے اس نے روکٹ میں قدم رکھا۔ دروازہ فوراً بند ہوگیا۔ کوک پٹ میں بیٹھ کر سب کل پرزے دیکھے بھالے کچھ پلے نہ پڑا۔ متعدد دلیش بٹن اور سوئچ اور روشن ڈائل جن پر صدیوں کے اعداد و شمار تھے سرخ رنگ کی سوئی ۱۹۶۶ء پر ساکت کھڑی تھی۔

اب کیا ہوا کہ ڈاکٹر صاحب باہر نکلنے کے لئے سیٹ پر سے اٹھنے لگیں تو ان کی داہنی کہنی "۱۳۱۵ ، ق ۔م" والے پش بٹن سے ٹکرا گئی۔ سفید روشنی کا ایک کوندا لپکا۔ زون۔ زون۔ پل کی

پل میں روکٹ نہ معلوم کہاں سے کہاں۔ ڈاکٹر گرین کے ہوش اُڑ گئے۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑے، سر گھوم گیا۔ آنکھیں بند کیں، آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف روشن آسمان نیچے نیلا سمندر، دریا کا ڈیلٹا۔ دلدل۔ سرکنڈے۔ ریگستان اطمینان کا سانس لیا۔ ابھی کہاں کا سائنس فکشن۔ وہی اپنی جانی پہچانی پرانی دھرانی دنیا تھی۔ شکر خدا کا۔ روکٹ زمین پر آتر چکا تھا۔ مُرخ سوئی "۱۲۱۵ ق۔م" پر اٹک گئی۔ دروازہ خود بخود کھلا پدما میری باہر نکلی۔ سامنے جھیل کے کنارے ایک ننھا گڈریا پتھر پر بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔ کھجوروں کے نیچے بکریاں چر رہی تھیں۔ افق پر اہرام۔ گڈ ہیونز۔ یہ تو مصر نکلا۔ گڈ اولڈ ایجپٹ۔

دو برس قبل نیویارک سے ممبئی جاتے ہوئے وہ مصر سے گزری تھی۔ اہرام کی خوب تصویریں کھینچیں۔ یہی چرواہے۔ یہی نخلستان۔ یہی فلاحین۔

یہ ۱۲۱۵ ق۔م کہاں سے آیا۔ صریحاً ۱۹۶۲ ہے، چلو بھئی۔ نہ ٹائم مشین۔ نہ کچھ۔ تازہ ترین قسم کا روکٹ ہے۔ جسے کوئی ورننگ امریکن یا روسی سائنسدان ہمارے یہاں لایا ہوگا۔ یہ سوچ کر اسے اطمینان ہوا۔

اچانک ایک اور پریشانی۔ ممکن ہے یہ جگہ سوئز کے نزدیک ہو۔ مشتبہ حالات میں پھرتی" بگڑ گئی تو اور مصیبت۔ ہندوستان مصر کا لاکھ دوست سہی مگر نہ پاسپورٹ نہ ویزا۔ اب فوراً پہنچنا چاہیئے۔ انڈین ایمبیسی کائیرو!

اہرام کے آس پاس کے فلاحین اور چرواہے مغربی سیاحوں کی مسلسل آمد و رفت کی وجہ سے تھوڑی بہت انگریزی سمجھ لیتے ہیں۔ لہٰذا پدما میری نے اس گڈریے سے کہا۔ کائیرو۔ بس۔ ٹیکسی۔ اوٹو موبیل۔" لڑکے نے سر ہلایا۔ دور ایک کسان گدھے پر سوار سرپٹ چلا جا رہا تھا۔ لڑکے نے اسے آواز دی۔

وہ دھول اڑاتا قریب آیا۔ گڈریے نے اس سے کچھ کہا۔

تب دفعتاً پدما میری پر ایک خوفناک انکشاف ہوا۔ گڈریا اور کسان جو زبان بول رہے تھے، وہ عربی نہیں تھی (کولمبیا یونیورسٹی کے لبنانی طلبہ سے کافی عربی سنی تھی۔) اور یہ اجنبی بھاشا نہ صرف اس کی سمجھ میں آ رہی تھی بلکہ اس نے خود کو اس ادق افریقی زبان میں فر فر باتیں کرتے پایا۔ "قاہرہ" اس نے دریافت کیا۔ "یہاں سے کتنی دور ہے۔؟"

دونوں مصریوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

معاً اس نے کہا۔ "ممفس۔"

کسان نے ایک سمت کو اشارہ کیا۔ وہ اچک کر گدھے پر سوار ہو گئی۔ بھوک کے مارے برا حال تھا۔ شہر پہنچ کر سب سے پہلے کچھ کھاؤں۔ مگر فارن ایکس چینج کا کیا ہوگا۔ اور یہ قدیم جاہل جپٹ لوگ کہیں میرا روکٹ توڑ پھوڑ کر برابر نہ کر دیں۔ پلٹ کر دیکھا۔ اس اثنا میں چار پانچ گڈریے روکٹ کے گرد جمع ہو چکے تھے اور سجدے میں پڑے تھے۔ اُسے دیکھ کر باقی بھی غڑاپ سے سربسجود ہو گئے۔

ان میں سے ایک نے زمین پر پڑے پڑے نعرہ لگایا "مرحبا۔ دیبی حاتور!"

باقیوں نے کورس میں کہا۔ "آسمانی رتھ پر آنے والی مادرِ ہتوس ہم پر کرم کر۔"

پدما میری چند لمحے خاموش رہی۔ پھر وقار سے بولی "میرے بچو۔ میں دیبی حاتور کی داسی ہوں۔ ایک خفیہ کام سے دیبی نے مجھے زمین پر بھیجا ہے۔ کسی کو میرے متعلق ہرگز نہ بتانا ورنہ دیبی کا ایسا قہر نازل ہوگا کہ یاد کرو گے۔ اور میرے آسمانی رتھ کی نگرانی کرتے رہو۔ خبردار جو اسے ہاتھ بھی لگایا۔"

ممفس بڑا بارونق شاندار شہر تھا۔ جیسا کہ ممفس کو ہونا چاہیئے تھا۔ گدھے والا کنیز جانور کی دہشت میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اسے ایک چوک میں اتار کر بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ پدما نے چاروں طرف دیکھا۔ یہاں ریستوران نہیں ہوتے ہوں گے ؟ اس نے سوچا۔ وہ ایک بڑی دوکان کے سامنے کھڑی تھی۔ اندر الماریوں میں پیپائرس کے گٹھر رکھے تھے۔ ایک جوان خوش شکل، سرو قامت، سنہری لنگی جس پر سیاہ دھاریاں پڑی تھیں، چنی ہوئی ململ کی قبا، گلے میں چوڑا طلائی کنٹھا، زلفوں کے جوکور پٹے، پیشانی پر بالوں کی جھالر۔ دوکاندار سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ حبشی غلام اس کے پیچھے پیپائرس کے بنڈل اٹھائے کھڑے تھے۔

اب یہاں سے سائنس فکشن میں رومانس شروع ہو جانا چاہیئے۔ مگر نہیں ہو گا۔

پدما بھوک سے بے حال تھی۔ ریستوران کی تلاش میں ذرا آگے بڑھی تو ایک بند دوکان جس پر لکھا تھا کرائے کے لئے خالی ہے، کے تھڑے پر ایک باریش بزرگ اکڑوں بیٹھے تسبیح پھیرتے نظر آئے۔ سر پر گول ٹوپی، لمبا جبہ۔ کوچین کے یہودیوں یا سیرین چرچ کے پادریوں یا موپلا مولویوں کی سی وضع قطع۔ ہالی وڈ کے فلموں والے "پیریڈ کوسٹیوم" پہنے قدیم مصریوں کے اس انبوہ کثیر میں یکلخت ایک مانوس سی شخصیت۔ اسی وقت ایک لمبا تڑنگا خشم ناک مصری چابک اور ایک طویل کاغذ لہراتا بازار کی بھیڑ میں سے نمودار ہوا۔ کاغذ پیر مرد کو تھمایا اور اکڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بزرگ نے نوشتے پر نظر ڈالی اور رولدوز آواز میں پکارے۔

"میخائیل بن حنان۔"

لمبی پتلی ناک، سیاہ حساس آنکھوں، حساس چہرے والا ایک عبا پوش نوجوان برابر کی گلی سے

برآمد ہوا۔" خدائے واحد کی لعنت ہو اس بدبخت زمانے پر۔"

"اے عزیز! گریہ کر۔ اور سر پہ خاک ڈال کہ تیرا نام بھی فہرست میں آگیا۔"

میخائیل کا رنگ زرد پڑا۔ اور اس نے آہستہ سے کہا" رب ذوالجلال، شاید توت کے دل میں نیکی ڈال دے۔ وہ رب ذوالجلال میری روشنی اور میری نجات ہے۔ جس نے اسرافیل شاہ تنغار اور آریوخ شاہ ایلازار کے عہد میں اہل ایمان کی حفاظت کی۔"

"امیرزادہ توت؟" بزرگ نے سرگوشی میں پوچھا۔

یا ربی! میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ کاغذ خریدنے آیا ہے میں اس سے بات کرتا ہوں۔ وہ میرا کلاس فیلو رہ چکا ہے۔ وہ میری مدد کرے گا۔"

میخائیل جو عہد نامہ قدیم کے اولین صحائف سے بھی پہلے کی عبرانی میں بات کر رہا تھا۔ اس نے یہ لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ لیکن میں قدیم ترین قبطی اور عبرانی دونوں سے ناواقف ہوں۔ (واضح ہو کہ ڈاکٹر مگرگرین اس وقت عبرانی بھی بخوبی سمجھ رہی تھی)

میخائیل لپک کر شیشنری مارٹ میں گیا۔ پدما سڑک کے کنارے کھڑی یہ سارا ماجرا دیکھتی تھی۔ خورد سنہرے نوجوان نے زرد رو عبرانی سے پوچھا۔" کہو میخائیل آج کل کہاں رہتے ہو؟"

دریائی چنگی پر کام کرتا ہوں۔"

بہت خوب، بہت خوب کبھی کبھی ملتے رہو۔ سنہرے نوجوان نے سرپرستانہ انداز میں اس کا کندھا تھپکایا۔

"توت مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" عبرانی لڑکے نے جھک کر کہا اور سرگوشی

میں اُسے کچھ بتایا۔ امیرزادہ ثوث باوقار انداز میں ایک ابرو اٹھا کر بہ غور سنتا رہا۔ پھر بولا۔

"فکر نہ کرو۔ میں آنریبل منسٹر سے بات کروں گا۔"

دفعتہً ان دونوں نوجوانوں کی نظریں اس اجنبی لڑکی پر پڑیں۔ دونوں ایک ساتھ سیڑھیاں اُترے۔ امیرزادہ ثوث نے اپنی کہنی کی جنبش سے مینخائیل کو پیچھے ہٹایا۔ ظاہر تھا کہ ثوث اور مینخائیل میں آقا و محکوم کا رشتہ ہے۔ اب امیرزادہ ثوث ڈاکٹر گرین کی طرف آرہا تھا۔

پدما نے جلدی جلدی سوچا ان لوگوں سے اگر کہوں کہ انڈین ڈانسر ہوں، فارن ٹور پر نکلی ہوں۔ کیا پتا بے جا کر بازار میں بیچ ڈالیں "وہ وہی جانوروں کی دای۔ والی بات بہتر ہے مگر کسی مندر میں پہنچا کر ناک میں اتنی دھونی دیں گے کہ پانچ دس منٹ میں دم نکل جائے گا۔ اصل واقعہ بتاؤں تو ان کی سمجھ میں نہ آئے گا۔ ان کی کیا خود میری سمجھ میں نہیں آرہا۔

امیرزادہ ثوث اس کے سامنے کھڑا تھا۔ "لڑکی تم کون ہو؟" اس نے ذرا ڈپٹ کر پوچھا۔ "اور ہماری باتیں اتنے غور سے کیوں سن رہی ہو؟ کس ملک کی جاسوس ہو؟ ایلام؟ اسوریہ اراتو۔۔؟"

پدما نے ہونقوں کی طرح زور زور سے سر ہلایا۔ اور خوف سے لرز گئی۔ ثوث اس کی نائیلون کی ساڑھی اور امریکن بیگ کو دھیان سے دیکھ رہا تھا۔ پدما نے عجز سے کہا۔ "حضور! شہزادہ سلامت! کنیز بھوک سے بیدم ہے۔ پہلے کچھ کھلا دیجئے۔ بندی سب کچھ سچ سچ عرض کردے گی!"

"میرے ساتھ چلو۔" امیرزادے نے حکم دیا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے ہولی۔ نکڑ پر رتھ اسٹینڈ تھا۔ یا رتھ پارک کہہ لیجئے۔ امیرزادے نے پدما کو اپنے برابر بٹھال کر اسپ کو چابک لگایا۔

وہ بازار سے نکلے اور ہیلیوپولس کے فیشن ایبل محلے میں پہنچے۔ کشادہ سڑک کے دونوں جانب

شاندار مکان استادہ تھے۔ کوڑا کرکٹ پڑا تھا۔ بچے کھیل رہے تھے۔ ایک سہ منزلہ حویلی کے سامنے پہنچ کر رتھ رکا۔ وہ اُتر کر برآمدے میں گئے۔ جس کے قرمزی بیل پایوں کے سرے کنول کے ڈھنگ کے تراشے گئے تھے۔ ایک سیاہ فام بھینگے غلام نے سُرخ رنگ کا صدر دروازہ کھولا۔ وہ ہال میں داخل ہوئے۔ اس کے جھلملاتے سرمئی فرش کے وسط میں سنگ سیاہ کا حوض تھا۔ سنہرے فیتوں میں سے لپٹے پپائرس کے رول الماریوں میں رکھے تھے۔ دیواروں پر رنگین فریسکو، یک رُخی شکلوں کی قطاریں، سنہرے کاؤچ اور کرسیاں! لگتا تھا یہ سارا فرنیچر برٹش میوزیم کے ایجپشین رومز سے واپس لاکر یہاں سجا دیا گیا ہے۔

ثوث نے کھانا لانے کا حکم دیا اور حوض کے کنارے بچھی چرمی گدّوں والی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سینڈل اتارے اور سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر میری گرین کو دیکھنے لگے۔

پدما میری نے مقابل کی کرسی پر ٹک کر گلا صاف کیا۔ حضور۔ میں۔ میں انڈیا سے آرہی ہوں۔"

"؟ ـــــ"

"رقص کرتی ہوں ـــ" اس نے کھڑے ہو کر کچی پُڈی کے چند مدرا دکھائے۔ ثوث قطعی متاثر نہ ہوا۔ وہ پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔ "جس بادبانی جہاز پر ـــ" اس نے بہت سوچ بچار کر کے کہنا شروع کیا۔ "بادبانی جہاز پر آرہی تھی وہ سویز کنال میں تباہ ہو گیا۔ میں ایک تختے پر ـــ"

"سویز کنال ـــ" ثوث نے بدقت یہ نام دہرایا اور مزید تشریح کا متوقع رہا۔ اب وہ بالکل ہڑبڑا گئی۔ ثوث نے جھنجھلا کر پوچھا۔ "اس عبرانی چھوکرے کو جانتی ہو؟"

عالیجاہ! رب جاثور اور اس کے بیٹے کی قسم۔ میں یہاں کسی کو نہیں جانتی حضور!" لگتا تھا مقدس ماں اور بیٹے کی قسم پر اسے دفعتہً اعتبار آگیا۔

"اچھا مجھے حضور، حضورمت کہو اور چلو کھانا کھاؤ۔" اس نے کہا اور پدما کو ایوان طعام میں لے گیا۔ کنیزوں نے نقرئی قابیں لا لا کر میز پر چننا شروع کیں۔ پدما نے صبح دس بجے بنگلور میں لیبورٹری کی کنٹین میں ڈاکٹر رام ناتھ اور ڈاکٹر رفیق فتح علی کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے فقط ایک پیالی کافی کی پی تھی۔ اس وقت شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ اس نے ثوث کی نظریں بچا کر رسٹ واچ اتاری اور بیگ میں رکھدی اور کھانے کی طرف متوجہ ہوئی جو خاصا بدذائقہ تھا۔

...

سورج دریائے نیل میں ڈوبنے والا تھا۔ اور صحرائی ہوا میں فرحت بخش خنکی آچکی تھی۔ وہ اپنے خلیق میزبان کے ساتھ محل کے طویل دالان میں ٹہل رہی تھی۔ اب تک اسے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ ثوث کا اصل نام اسطالیس تھا۔ ثوث اس کا سرکاری لقب تھا۔ یہی لقب اس کے باپ کا بھی تھا۔ اور ربّ ایوانِ کتب ثوث ہر میز کے نام پر رکھا گیا تھا۔ (اس دیوتا کا ہیبت ناک بت اندر ہال میں ایک مقدس بلی کی ممی کے نزدیک استادہ تھا)

مسٹر ثوث سینئر فرعون کے چیف اسکرائب اور خاندانی رئیس تھے۔ ثوث جونیئر بھی لکھتا لکھتا رہتا تھا۔ رسم الخط چونکہ تصویری تھا لامحالہ مصوری بھی آتی تھی۔ درباری سازشوں سے الگ رہتا تھا اور شہر کے ادیبوں اور مصوروں کے حلقے میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔ اپنے ملک کے بہت سے دقیانوسی عقائد اور رسوم سے نالاں تھا۔ لیکن یہ بڈھے نئی نسل والوں کی کچھ نہ چلنے دیتے تھے۔

چنانچہ یہ ہے "مصر قدیم کے اسرار اور رومان کی اصلیت" پدما نے مایوسی سے سوچا۔

لائبریری میں جو کاتب بیٹھے صحیفہ متوفین کی نقلیں کرنے میں معروف تھے، ان میں سے ایک

کوز کام ہو رہا تھا۔ دوسرا مسلسل اپنا سر کھجا تا تھا۔ دو نوجوان کاتب برابر ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ الوتی نامی کنیز نہ حسین تھی نہ مہ جبیں، چیچک رو اور بد لیسل۔ خود ثوث بالکل نارمل سا لڑکا تھا۔ سوائے اس کے کہ کوٹ پتلون کے بجائے ہالی وڈ والی پیریڈ کوسٹیوم پہن رکھی تھی۔

فرعون اپنی افواج کے معائنے کے لئے اشوریہ کی سرحد پر گیا ہوا تھا۔ اشوریہ سے کئی سال سے لڑائی جاری تھی۔

"ہم دنیا کی قدیم ترین تہذیب ہیں" ثوث نے ٹہلتے ٹہلتے بڑے جوش سے کہنا شروع کیا "یہ کلدانیہ اور اشوریہ والے بھی اپنے متعلق یہی دعویٰ کرتے ہیں اور ہم سے لڑنے آتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ ہمارا ان کا کیا مقابلہ۔ ہم ان سے ہر لحاظ سے برتر ہیں۔"

پدما زیر لب مسکرائی "مگر ایک بات ضرور ہے" ثوث نے دالان کے کتب خانہ میں واپس آتے ہوئے کہا "کلدانی اور اشوری بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ یہ الواح دیکھو، اور ساتھ ہی اس قدر سفاک" اس نے سفالی الواح کے انبار کی طرف اشارہ کیا۔ جنگ سے پہلے ان کی یہ کتابیں سینکڑوں اونٹوں پر لاد کر ہمارے یہاں لائی جاتی تھیں" اس نے جھک کر باریک خط میخی میں کندہ ایک لوح اٹھائی۔

"یہ تو میں برٹش میوزیم" پدما نے فوراً زبان دانتوں تلے دبائی۔ پھر جلدی سے پوچھا "تم یہاں تنہا رہتے ہو ثوث؟"

"والد بادشاہ سلامت کے ہمراہ محاذ کے معائنے کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ اماں اور بہنیں ملکۂ عالم کے ساتھ موسم گرما کے لئے تھیبز جا چکی ہیں۔ جانا تو مجھے بھی ہے۔ ملکۂ عالم نے وہاں جل محل

کی دیواریں مصور کرنے کا حکم دے رکھا ہے لیکن میں جب تک صحیفہ[۱] متونیلن کا نیا ایڈیشن پورا نہیں کر دالیتا کہیں جا نہیں سکتا۔"

ایک بات بتاؤ ثوث۔ تم لوگ موت سے اس قدر مسحور کیوں ہو۔۔؟ پدملنے دریافت کیا۔

اور کاہے سے مسحور ہوں؟ فانی زندگی سے؟" ثوث نے سوال کیا۔ وہ اس کے ساتھ الماریوں کے آگے سے گزر رہی تھی۔ (اب وہ تصویری رسم الخط بھی پڑھ سکتی تھی) اس نے مختلف عنوانات پر نظر ڈالی۔ مذہب، اخلاقیات، قانون، طب، علم نجوم، خطابت، ریاضی، اقلیدس، سونامے ناول ایلیف[۲] کا لکھا ہوا رومان۔

"موت کے علاوہ اور دلچسپیاں بھی ہیں۔" ثوث نے مسکرا کر کہا۔ "یہ سب کتابیں یہاں سے نقل کروا کے ہیلیوپولس کے کالج اور لائبریری میں بھیج دی جاتی ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا تم لوگ اتنے پڑھے لکھے تھے۔ میرا مطلب ہے۔ ہو۔ اقوال تاہ ہوتیپ[۳] ۔ کیا فرماتا ہے تمہارا تاہ ہوتیپ۔"

"وہ فرماتا ہے۔" ثوث نے ایک ریشمی پارچے کا ٹکڑا الماری میں سے کھینچا اور پڑھنا شروع کیا۔ "انسانوں میں خوف و دہشت نہ پھیلاؤ خدا اس کی سزا دے گا۔ جو شخص کہتا ہے ساری طاقت

---

[۱] BOOK OF THE DEAD: دنیا کی قدیم ترین کتاب ہے جو آج سے تقریباً چھ ہزار سال قبل مصر میں لکھی گئی۔ اس کا ایک ایک نسخہ حنوط شدہ لاشوں کے ساتھ دفن کیا جاتا تھا۔

[۲] ایلیف ۲۶۰۰ ق، م [۳] تاہ ہوتیپ ۲۵۵۰ ق م میں ممفس میں پیدا ہوا تھا۔

اور سارا اقتدار میرا ہے اکثر وہی ٹھوکر کھا کر گر بھی پڑتا ہے۔ ہمیشہ بیت ترحم میں سکونت رکھو۔ دینے والا خدا ہے۔ بندہ نہ سمجھے کہ وہ خود کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ اور خبردار۔ الفاظ کے ذریعہ کبھی فساد نہ پھیلانا ۔"

وہ پھر ٹہلتی ہوئی صحیفہ متونین کے کاتبوں کی طرف آئی اور دوزانو بیٹھ کر دیکھنے لگی۔ ایک موٹے کاتب نے ناک سکتے ہوئے ایک تصویری لفظ کے گرد قرمزی موقلم سے بیضوی حلقہ کھینچا۔

"یہ ایک بادشاہ کا نام ہے"۔ اس نے چھتری کی تصویر بنائی "شمالی مصر کا تاج سرخ۔ جنوبی کا سفید اور فرعون سورج دیوتا رع کا بیٹا ہے" کاتب نے اسے بتایا۔ سورج کے لئے بطخ کی شکل بنا کر اس کے بیچ میں لفظ لگا دیا اور پانی پینے کے لئے اٹھا۔

"صحیفہ متونین میں بیالیس اخلاقی احکام درج ہیں" ثوث نے کہا (موسیٰ نے تو یہاں سے جا کر صرف دس احکام ہی دیئے۔ شکر ہے پدما نے سوچا)

اور ہمارے یہیں شاہی خاندانوں کے حالات درج ہیں جو پچھلے تین ہزار سال تک مصر پر حکمران رہے ۔"

"صاحب" ایک بڑا کاتب بولا "اب چھٹی کریئے مجھے بہت دور جانا ہے۔ بیوی بیمار ہے۔ کل کے پیسے ملیں گے" ؟

"کتنی بار لوگے۔ پیشگی بھی لے چکے ہو" ثوث نے بگڑ کر کہا۔

"صاحب مجھے بھی کچھ رقم ادھار دے دیجئے۔ میرا لڑکا" دوسرا ملتجی ہوا۔

آہ مصر قدیم کا رومان۔ پدما وہاں سے اٹھ کر دالان میں آگئی۔ ثوث کاتبوں سے نپٹ کر باہر

آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پارچہ تھا۔" تمہاری دل چسپی کے لئے صحیفہ متوفین کی ایک حمد نکال کر لایا ہوں۔" اس نے پدما کو چڑانے کے لئے تبسم کے ساتھ کہا۔" اس کا عنوان ہے ایک مردہ زندہ ہو کر رَع کی مناجات کرتا ہے، سنو۔"

اس نے برآمدے کے جنگلے پر ٹیک کر پڑھنا شروع کیا۔" تیرے پر جلال طلوع پر تیرے کاہن ہنستے ہوئے باہر نکلے۔ تری کشتی سحر سفینہ شب سے آملی۔ اور الوہ کے ایوان آوازوں سے گونج اٹھے۔ زمانے گزر جائیں گے۔ وقت تیرے نیچے اپنی خاک اڑاتا رہے گا۔ تو کہ دوش دامروز و فرداہے۔ اے رَع لاکھوں برس گزر گئے۔ لاکھوں گزر جائیں گے۔ انوتی کھانا لگاؤ۔"

"تم کھانا بہت جلد کھا لیتے ہو۔" پدما نے کہا۔

"ہاں ورنہ پھر مچھر اور پتنگے بہت ستاتے ہیں۔"

"تم آج شام کو کیا کر رہے ہو؟"

"انوتی۔" توث نے دوبارہ پکارا۔" معلوم کرکے آؤ جشن ہورس کے بجے شروع ہوگا؟"

"شروع ہو چکا۔" انوتی نے جو کافی منہ چڑھی تھی اندر سے جواب دیا۔

"اچھا ابھی کھانا رہنے دو۔ چلو۔" اس نے بیدلی سے پدما کو مخاطب کیا۔" تمہیں باہر گھما لاؤں۔ میں نے یہ تماشا اتنی بار دیکھا ہے کہ عاجز آچکا ہوں۔ چلو۔"

وہ دالان سے اُتر کر نیم تاریک سڑک پر آئے۔ کچھ لوگ تھیٹر ہال کی سمت جا رہے تھے۔ ہیلیو پولیس بہت وسیع علاقہ تھا آدھ میل چلنے کے بعد راستے میں ایک مقبرہ پڑا۔ اس سے ملحق معبد میں بڑی خلقت جمع تھی۔ عود و لوبان کے مرغولے باہر نکل رہے تھے۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے۔؟" پدما نے پوچھا۔

"کسی آنجہانی فرعون کی روح کو نذرانہ چڑھایا جا رہا ہوگا۔ دیکھوگی؟" وہ پدما کا ہاتھ پکڑ کر معبد کے تنگ صحن میں لے گیا۔ "آج کس کی رات ہے۔؟" اس نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"فرعون نفر کا رَع" اس شخص نے جواب دیا اور زیر لب منتر دہرانے میں مصروف ہو گیا۔ ثوث اور پدما دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ اندر مقبرے کے سنگلاخ تہ خانے میں نفر کا رَع کا کھلا تابوت دیوار کے سہارے کھڑا تھا۔ ململ کی پٹیوں میں ملفوف ممی بالکل جیتی جاگتی معلوم ہوتی تھی۔

"موصوف کو مرے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ یہی کوئی ایک ہزار سال ہوئے ہوں گے۔" ثوث نے سرگوشی میں پدما کو بتایا۔

کاہن کی لرزہ خیز آواز گونجی "او بادشاہ نفر کا رَع! چشم ہورس قبول کر اور اسے اپنے چہرے تک لے جا۔" پھر اس نے روٹی اور جَو کی شراب کا پیالہ سونے کی تھالی میں رکھ کر ممی کے سامنے پیش کیا۔ "او نفر کا رَع جس کا جاہ و جلال ختم ہو چکا جو کچھ تیری طرف سے آیا ہے اس پر نظر کر اور غسل کر۔ چشم ہورس کے وسیلے سے منہ کھول۔ او بادشاہ نفر کا رَع۔"

پجاریوں کے اژدہام کی وجہ سے دم گھٹا جا رہا تھا ثوث پدما کو باہر لایا۔ "اب ناٹک بھی دیکھوگی؟"

"اس میں بھی یہی چشم ہورس کا وظیفہ ہوگا۔" پدما نے گھبرا کر پوچھا۔ "اتنی دور چل کر آئے ہیں تو دیکھ ہی لیں۔"

ثوث چپ چاپ پھر اس کے ساتھ سڑک پر آ گیا۔ بے چارہ مجھے انٹرٹین کرنے کی خاطر کتنا بور ہو رہا ہے مگر اتنی ڈپریسنگ اندھیری شام اور کس طرح گزاری جائے۔ تھیٹر ہال وہاں سے زیادہ دور

نہ تھا۔ پہلے شروع ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔

اسٹیج پر ہورس ثوث، سیت او سارس دیوتا لوگ اور چند گوالین قصائی اور بچے موجود تھے۔
ہورس نے بچوں سے کہا "میری دنیا کو میری آنکھ سے منور کر دو۔" اسی وقت پردہ گر گیا ہے۔ دوسرا
سین شروع ہوا۔ عقیق کی مالا اسٹیج پر لائی گئی۔ ہورس نے سیت سے کہا "میں نے اپنی آنکھ اٹھالی
جو تیرے لئے مثل عقیق ہے۔ میری آنکھ لاؤ جو تیرے لئے عقیق کی طرح سرخ ہو گئی تھی۔ جو تیرے
منہ میں جاکر سُرخ خون کی طرح سرخ ہو گئی۔"

پدما نے ثوث سے سرگوشی میں پوچھا "کیا ہو رہا ہے۔"

"چمکیلے آسمان کے دیوتا ہورس کو رب طوفان سیت نے اندھا کر دیا تھا۔ رب طوفان وہ آنکھ
ہورس کو واپس کر دیتا ہے۔ یعنی طوفان کے بعد پھر خوشگوار موسم۔"

پدما نے سوچا۔ مصر میں ریتلے طوفان سے اندھے ہونے کی بیماری اتنی قدیم ہے اور اس کی
کیسی اساطیر تیار ہوتیں۔

یہ تماشا تو ابھی بہت دیر تک جاری رہے گا۔ چاند نکل آیا ہے۔ دریا پر چلتی ہو؟" ثوث
نے دریافت کیا۔

اگر تم بُرا نہ مانو ثوث! تو میں اب گھر جاکر سوؤں گی۔ صبح آٹھ بجے دفتر۔" اس نے پھر
اپنے آپ کو چیک کیا۔

"بہت خوب۔" ثوث نے کہا۔ وہ گھر واپس پہنچے۔ غلام کھانے کی میز پر ان کے منتظر تھے۔
ڈنر کے دوران میں پدما نے اپنے میزبان سے پوچھا "ثوث۔ تم نے مجھے عبرانیوں کی جاسوس کیوں

سمجھا تھا؟ کیا یہ لوگ تمہارے لئے ایک مسئلہ ہیں۔؟"

"ہاں" تورش نے مچھلی سے کانٹا نکالتے ہوئے جواب دیا۔ مشعلوں کی روشنی اس کے تشکیل چہرے پر جھلملا رہی تھی۔ مگر ہمارے فرزانروائوں نے اس مسئلے کا بڑا انسانیت کش حل تلاش کیا ہے سارے عبرانی مرد دل سے بیان لیوا بیگار لی جاتی ہے۔ یہ اہرام جو تم دیکھتی ہو ان میں سے کئی انہوں نے بنائے ہیں۔ بیچارے لاکھوں من پتھر میلوں سے دور ڈھو کر لاتے ہیں اور خون تھوک کر مر جاتے ہیں۔ بےچارہ میخائیل۔ اسے دریائی جنگی پر منشی گیری مل گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بچ نکلے گا۔ مگر اس کا نام بھی فہرست میں آگیا ہے۔"

"تم کچھ نہیں کر سکتے؟"

"میں۔ ایک پورے نظام کے خلاف کیا کر سکتا ہوں؟" اس نے افسردگی سے پوچھا۔

کھانے کے بعد تورش اسے بالائی منزل پر ایک بڑے کمرے میں لے گیا جس کا فرش زرد سوڈانی پتھر کا تھا۔ دریچے کے نزدیک منقش پالیوں والی مسہری بچھی تھی۔ وسط میں آبنوس کی گول میز ایک طرف چند منقش چوبی صندوق، سنگھار میز کے فولادی آئینے کے سامنے ہاتھی دانت کی مرصع کنگھی، ماہی نما نقرئی سرمہ دانی، سرخی اور غازے کی جڑاؤ شیشیاں، اور اسی طرح کا دوسرا نسوانی الم غلم۔

"یہ میری چھوٹی بہن کا کمرہ ہے۔" تورش نے کہا۔ "تم یہاں آرام سے سو جاؤ۔ صبح جس وقت چاہنا اٹھنا۔ انوبی کو آواز دے لینا وہ غلام گردش میں سوئے گی۔ شب بخیر۔"

"شب بخیر تورش۔"

وہ سر جھکائے شہ نشین میں سے گزرتا زینے کی طرف چلا گیا۔

پلنگ پر لیٹ کر وہ بہت دیر تک باہر دیکھتی رہی۔ کھڑکی کے عین نیچے سنگ سُرخ کا وسیع تالاب تھا۔ جس میں کنول کھلے تھے۔ دور صحرا پہ چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔ اس نے ایک جھپکی لی تھی کہ مچھروں کی بھنبھناہٹ نے چونکا دیا۔ یہ بڑا مچھر اس کی ناک پر بیٹھا تھا۔ وہ جھنجھلا کر اُٹھ بیٹھی اور پھر دریچے کے باہر جھانکنے لگی۔ تھوڑی دیر میں بانسری کے سُر خاموش فضا میں بلند ہوئے۔ اس نے نیچے جُھک کر دیکھا وہ توت تھا۔ جو تالاب کی سیڑھیوں پر چاند کے رخ بیٹھا بانسری بجاتا تھا۔

کہیں یہ بے چارہ عشق میں تو مبتلا نہیں ہو گیا۔ یقیناً ہو گیا۔ آدھی رات کو بیٹھے بیوقوفوں کی طرح بانسری بجا رہے ہیں۔ اب بھاگو یہاں سے صبح منہ اندھیرے۔

ہیلیوپولس سے شہر پناہ تک کا راستہ یاد ہے وہاں سے حُرمے کے جھنڈ تک پہنچنے میں آدھ گھنٹہ لگے گا۔ روکٹ میں سات بجے تک گھر۔ یہ حساب لگا کر وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ کچھ دیر توت کی بانسری سنا کی۔ پھر اسے گہری نیند آ گئی۔

ایک گھمبیر آواز نے اسے صبح پانچ بجے ہی جگا دیا۔ اس نے تکیے سے سر اُٹھا کر باہر جھانکا۔ تالاب کے کنارے ایک بہت لمبا تڑنگا ہیکل معمر آدمی جو حلیے سے توت کا خاندانی کاہن معلوم ہوتا تھا۔ ایک کنول نما ستون پر کھڑا بازو ہلا ہلا کر پانچ سروں میں ربّ کی حمد خوانی کر رہا تھا۔

مرحبا آتون ۔ مرحبا ۔ خرپر

لبیک چشم ہورس —

اتوم — ربّ الشمس ۔ خالق اکبر تاہ — سارے جانداروں کے دلوں میں موجود ۔ تاہ — جو

سوچتا ہے سو ہوتا ہے اپنے کلمے[1] سے اس نے کائنات تخلیق کی۔ آتاہ تابین۔ بجرے پر سوار ہوتی ۔ اتوم ۔ خالق جن و بشر۔ ان داتا۔ میں نے اقوام عالم کی تفریق ان کی رنگت سے کی جس کی محبت میں نیل رواں رحیم و کریم۔ خدائے واحد۔

دریا کی مچھلی اور آسمان کے پرندے کو زندہ رکھنے والے۔

کیڑوں اور پتنگوں کے پالن ہار۔

آمون۔ آتون ہر لمحہ۔

میرے اوپر جگمگاتا رہ۔

تیرے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں۔"

رع کی روشنی افق پر پھیلنے لگی۔ ٹوٹ کا پروہت لمبے لمبے ڈگ بھرتا مندر کی سمت چلا گیا جس کی پرشکوہ عمارت فجر کے دھندلکے میں دور سے نظر آرہی تھی۔ پدما نے تکیے کے نیچے سے بیگ نکالا۔ کل سے اس نے چائے کافی کچھ نہ پی تھی اور سر میں درد ہو رہا تھا۔ صبح کو یہ لوگ جانے بریک فاسٹ کیا کرتے ہوں گے تعجب کی بات ہے۔ چائے کی دریافت سے پہلے لوگ کس طرح زندہ رہتے تھے۔ اب یہی دیکھ لو ٹوٹ کس مزے سے جی رہا ہے۔ چائے کافی سگریٹ، سینما، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، ہوائی جہاز، کمپیوٹر، ایڈورٹائزنگ، پبلک ریلیشنز، جرنلزم بے چارہ کچھ

---

[1] شروع میں کلمہ تھا اور کلمہ خدا کے ساتھ تھا اور کلمہ خدا تھا۔ یوحنا کی انجیل کا ابتدائی جملہ ہے۔ عہد نامہ جدید مسیحی قرون اولیٰ میں لکھا گیا۔ آتاہ کی یہ حمد ۲۴۰۰ ق۔م کی تصنیف ہے۔

بھی نہیں جاتا، پرنٹ۔ اس نے پھر نیچے جھانکا۔ میاں ٹوٹ تالاب میں غوطہ لگا رہے تھے اور نیلگوں پانی کا عکس محل کی زمردیں دیواروں پر جل پریوں کے مانند رقصاں تھا۔

تیرتے، تیرتے ٹوٹ نے سر اٹھا کر اوپر جھروکے پر نظر ڈالی اور مسکرایا۔ پھر سیڑھیوں پر جا کر ایک سرخ کنول توڑنے میں مصروف ہو گیا۔

بھاگو۔ بھاگو۔ سرپٹ۔

پدما ہڑبڑا کر اٹھی۔ چپل پہنے خواب گاہ کا دروازہ کھولا اور باہر نکلی۔ حویلی ابھی خاموش پڑی تھی۔ سارے لونڈی غلام برآمدوں میں فرش پر لمبی تانے سو رہے تھے۔ وہ دبے پاؤں زینہ اتر کر صحن میں آئی۔ مقدس بیل آئی بیریز کے مہیب بت کے نیچے سے گزرتی پکی سڑک پر پہنچی اور بھاگنا شروع کیا۔ مکانوں کے دروازے ابھی بند تھے۔ اکا دکا کنجڑا یا ماہی فرش بہنگیاں اور ٹوکریاں اٹھائے کہرے میں سے گزرتا نظر آجاتا تھا۔ ہانپتے، کانپتے اس نے در شہر پناہ پہنچ کر ہی دم لیا۔ مگر پھاٹک مقفل پڑا تھا۔ چند پہریدار اوپر فصیل پر ٹہل رہے تھے۔ چار پانچ سنتری پھاٹک کے سامنے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے للکارا۔ او چھوکری۔ کدھر منہ اٹھائے چلی جاتی ہے؟"

"دریا پر۔" اس نے ہکلا کر جواب دیا۔ "مچھلی پکڑنے۔"

"مچھلی کی بچی۔" آج جہاں پناہ واپس آرہے ہیں۔ ان کے آنے سے پہلے پھاٹک نہیں کھلے گا۔"

"کس وقت آئیں گے؟"

"کیا معلوم کس وقت آئیں گے۔ تو پوچھنے والی کون۔؟"

وہ نڈھال ہو کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ چائے کی طلب میں درد سر بڑھتا جا رہا تھا۔ رتھ میں آ رہا ہوگا۔ جوں کی چال، کمبخت فرعون کا بچہ۔ خدا اسے غارت کرے۔ نہ جانے کب تک پہنچے گا۔ اور اب تک اس حرافہ الزتی نے جا کر ثوث سے جڑ دی ہوگی کہ ہندوستانی رقاصہ غائب ہو گئی۔ وہ بے چارہ کیا سوچے گا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ کیا پتا اب اسے یقین ہو جائے کہ میں اشوری جاسوسہ ہوں پکڑوا دے پھر بھیانک قید خانہ۔ اور۔ اور۔ او مدر آف گوڈ۔ ہولی میری مدر آف گوڈ۔ برسوں بعد بے اختیار اس نے ساری دعائیں زور زور سے دہرانی شروع کر دیں۔ پھر اس پر منکشف ہوا کہ وہ قبطی میں "مادر خداوند۔ مادر خداوند" رٹے جا رہی ہے۔

ایک بانکا پہریدار ڈھال تلوار جھنجھناتا اس کے نزدیک آیا اور پوچھا۔ "او چھوکری! کیا تو ربہ آئی سس کے مندر کی دیو داسی ہے۔"؟

پدما نے بے بسی سے اثبات میں سر ہلایا۔

کیا کہتے ہو بھائی خوفو۔ دوسرا سنتری اسے بغور دیکھ کر بولا۔ یہ تو وہی ہے۔ دوشیزۂ فلک۔ کل رات ایک گڈریا مجھے بتا رہا تھا۔" دونوں سنتری فوراً اس کے سامنے سجدے میں گر گئے۔

عین اس وقت پھاٹک کی بھاری زنجیریں کھڑکھڑائیں۔ تفیری، نقارے اور طبل جنگ کی فلک شگاف صدائیں بلند ہوئیں۔ مسلح پیادے اور تیر انداز مارچ کرتے، گھوڑے ہنہناتے ارکان سلطنت کی سواری کے پیچھے داخل ہوئے۔ بے انتہا اونچا طلائی تاج اور لباس فاخرہ پہنے فرعون شمال و جنوب اپنے طلائی رتھ میں اکڑا بیٹھا تھا۔ شکل سے کافی بے وقوف معلوم ہوتا تھا۔ اس

بھیڑ بھڑکے، غل غپاڑے میں پدمانے نکل کر بھاگنا چاہا۔ ایک سپاہی نے نیزے سے اس کا راستہ روک لیا۔ "یہ جانوروں کی پیغامبر۔ دوشیزۂ افلاک۔ بلیک۔ چشم ہورس۔" بڑا زبردست شور مچا ہجوم نے اسے بری طرح گھیر لیا۔ اس کا دم ٹوٹنے لگا۔ اور اسے غش آ گیا۔

...

جب ڈاکٹر پدما میری ابراہام گرین کو ہوش آیا دن ڈھل رہا تھا۔ وہ قصر عین الشمس کے عبادت خانہ میں ایک جواہر نگار مسند پر نیم دراز تھی۔ طرح طرح کی خوشبوئیں سلگائی جا رہی تھیں۔ کاہنوں کی جماعت "آمون رع۔ تاہ [1]" کے ورد میں مصروف تھی۔ تاہ تھیپ۔ آئیتر۔ کا گیمنی۔ کسی کو کیا معلوم کیا ہونے والا ہے۔ یا خدا کس وقت اپنا فیصلہ صادر کرے گا۔ سرالیس، سرالیس ایڈفو۔ تاہ۔ تاہ۔ تاہ۔

ڈاکٹر گرین کا سر چکرا گیا۔ وہ پھر مسند پر ڈھیر ہو گئی۔ سامنے ضعیف العمر فرعون ایک طلائی کرسی پر بیٹھا دانت نکوسے بڑی دل چسپی سے اسے گھور رہا تھا۔ ایک نرم مزاج شاندار سا شخص جو ٹوٹ کا والد معلوم ہوتا تھا۔ بستہ سنبھالے بادشاہ کے نزدیک اسٹول پر بیٹھا تھا۔ دیلو امت چیف پروہت اور وزیر کمر۔ دیلو داسیوں نے بے چاری پدما کو گاؤ تکیئے کے سہارے بٹھایا اس نے نحیف آواز میں کہا "تھینک یو۔ بلیک کافی۔ پلیز۔ نو شوگر۔"

دوشیزۂ فلک کیا کہہ رہی ہیں۔ فرعون نے مرعوب آواز میں بڑے کاہن سے دریافت کیا۔

---

[1] قدیم مصری تثلیث تاہ کے آٹھ اوتار تصور کیئے جاتے تھے۔

اس نے سر ہلایا۔ "جہاں پناہ! یہ الوہی زبان میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔"

فرعون مصر ہاتھ باندھ کر ادب سے ڈاکٹر گرین کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور یوں گویا ہوا ——

"زہرہ جبیں دخترِ افلاک! یہ مصر کی عین خوش نصیبی ہے کہ اشوریہ سے جنگ کے دنوں میں مادرِ خداوند[1] نے تم کو یہاں بھیجا اور فتح کی بشارت دی۔ ما بدولت چونکہ خود رَع دیوتا کے فرزندِ ارجمند ہیں ہمارا فرض ہے کہ بطور مہمان نوازی و سپاس گزاری کل شام کے پانچ بجے تم سے شادی کر لیں ——"

پدما نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ یہ پیرِ فرتوت —— اس کی ممی ہیں نے برٹش میوزیم میں دیکھی ہے۔ میں اس سے شادی کروں گی —— کل —— اسے دوبارہ چکر آ گیا —— آنکھیں بند کر لیں۔ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔

"دوشیزۂ فلک مراقبے میں چلی گئی۔" چیف کاہن نے آہستہ سے کہا۔ کمرے میں بڑی مودبانہ خاموشی طاری تھی۔ اس وقت پدما کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ ایک موہوم سی اُمید۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور رکُ رکُ کر آواز میں کہا۔ "تخلیہ۔ تخلیہ —— میں دیبی سے رابطہ قائم کرنا چاہتی ہوں ——"

---

[1] دیبی حاثور ہورس دیوتا کی ماں مورتیوں میں شیر خوار ہورس کو دودھ پلاتی دکھائی جاتی تھی بحیثیت سب سے پہلے مصر، شام میں پھیلی اور قبطیوں نے عیسائی ہونے کے بعد "الوہی ماں اور بیٹے" کے تصور کو مریم و عیسیٰ کی پرستش میں منتقل کر دیا۔ کیتھولک کلیسا حضرت مریمؑ کو مادرِ خداوند کہتا ہے۔

زعون، ثوث کا باپ، چیف کاہن اور دوسرے حوالی موالی سب فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔

پدما نے دوسری آکاش بانی سنائی۔

"فرزند رَع سے شادی سے قبل مکمل تنہائی سب دروازے کھلے رکھو۔ پہرے دار ہٹا دو۔"

"جو حکم بنتِ تاہ۔" بڑے کاہن نے سر جھکا کر عرض کی۔

"کوئی ارضی مخلوق، مرد، عورت، چرند پرند مجھے اپنی صورت — نہ دکھلائے۔" وہ سب مع فرعون مصر فی الفور غائب ہو گئے۔

پدما نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ نذرانے میں جتنے پھل اور مٹھائیاں اسے پڑھائی گئی تھیں۔ چُن چُن کر کھائے تو وہ صاف کیں منتر پھونکا۔ شربت غٹ غٹ پی ڈالا۔ تب ذرا حواس بجا ہوئے۔ پھر دریچے سے باہر نظر ڈالی۔ شام ہو چکی تھی۔ ہر سو مشعلیں روشن تھیں۔ مغنیوں اور سازندوں کا طائفہ بارہ دری کی طرف جاتا نظر آیا جہاں ضیافت کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ بڑی گہما گہمی تھی۔ رفتہ رفتہ خاموشی چھائی۔ سارا شاہی خاندان درباری اور خدام زنگ محل کی سمت چلے گئے کچھ دیر بعد دریچے کے نیچے دو عبرانی غلام چپکے چپکے باتیں کرتے گزرتے: "نئی شادی کی خوشی میں جشن منا رہے ہیں۔ کل ہو گی۔ بڈھا بالکل بولا گیا ہے۔" پدما کھڑکی میں سے ہٹ گئی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ عبادت خانہ سے پنجوں کے بل باہر نکلی سنسان برآمدے کے سرے پر: ایک دراز ریش عبا پوش عبرانی حلقہ بگوش ہاتھ میں مشعل لئے چپ چاپ کھڑا تھا۔ مارے خوشی کے پدما کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے اشارے سے عبرانی کو اپنی بلایا۔ وہ پیر مرد مشعل دیوار کے بریکٹ میں اٹکا کر اس کے قریب آیا۔ پدما نے اس کے کان میں کہا۔ "چچا میں رتبہ جانور کی آسمانی

خواص نہیں ہوں ۔"

بوڑھے نے اسے دھیان سے دیکھا ۔ وہ بہت محتاط بزرگ تھا ۔ خاموش رہا ۔ پدما نے کہا ۔

"میرا نام مریم بنت ابراہیم ہے ۔ خدائے ابراہیمؑ و اسحٰقؑ کی قسم میرا نام ۔"

گرفتار بلا عبرانی ایک دوسرے کو فوراً پہچان لیتے تھے ۔ شکل سے یہ لڑکی بنی اسرائیل میں سے نہیں لگتی تھی مگر خدائے ابراہیمؑ کی قسم کھا چکی تھی ۔ بوڑھا متفکر ہوا ۔ لڑکی نے دوبارہ کہا ۔ "بابا — ربی — کیا آپ کا خیال ہے کہ میں دیسی جانور کی — "

"لاحول ولاقوۃ" مردِ ضعیف نے دفعتہً جوش سے کہا ۔

"میں مریم بنت ابراہیم ہوں ۔"

"جزاک اللہ ۔"

"مجھے کسی طرح عبرانیوں کے محلے تک پہنچا دیجئے ۔ میخائیل بن حنان کے گھر تک ۔"

"میخائیل بن حنان بہت عام نام ہے اور کچھ اتا پتا بتاؤ ۔"

وہ دریائی بندرگاہ کی چنگی میں ملازم ہے اور — اگر امیر زادہ ثوث ۔"

امیر زادہ ثوث اس وقت ایوانِ ضیافت میں فرعون ملعون کے ساتھ کھانا کھا رہا ہے ۔ تم کو اس بت پرست نوجوان سے کیا غرض ہے ۔ مریم بنت ابراہیم ۔ ؟"

"کچھ نہیں ۔" پدما میری ابراہام گرین نے جلدی سے کہا ۔

"میرے ساتھ آؤ ۔" اس نے اپنی عبا اتار کر پدما کو اڑھائی مشعل بجھائی اور راستے چور راستے سے باہر نکال لے گیا ۔ تاریک گلیوں میں سے گزرتے وہ ایک خراب و خستہ محلے میں پہنچے ۔ ایک

شکستہ دروازے پر جاکر بوڑھا آہستہ سے پکارا "شالوم علیخم یا یعقوب بن شمعون۔"

"شالوم کون ہے بھائی؟"

"حزقیل بن ذکریا۔"

"آجاؤ" وہ دونوں اندر گئے۔ وہ جمعہ کی رات تھی۔ ایک عمر رسیدہ عبرانی اس کی بیوی اور بچے زیتون کے تیل سے روشن منورہ کے سامنے بیٹھے راگ عدتون میں دھیرے دھیرے ایک مناجات گا رہے تھے۔ پدما میری نے عبا اتاری اور کھجور کی چٹائی پر بیٹھ گئی۔ پچھلے کمرے سے میخائیل بن حنان نکل کر آیا حزقیل بن ذکریا نے اس کے کان میں کچھ کہا اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔

...

۱۲۱۵ ق۔م کی اس شب جمعہ (مہینہ اور تاریخ مجھے معلوم نہیں) میری گرین نے ان دکھیاروں کی داستان سنی اور اپنی انہیں سنائی۔ یہ لوگ اس کے ماضی بعید میں موجود تھے اور وہ ان لوگوں کے مستقبل بعید سے آئی ہے۔ لیکن یہ غیر معمولی طور پر ذہین و فہیم انسان جو کچھ اس سے بتایا گیا بآسانی سمجھ گئے خصوصاً نوجوان میخائیل بن حنان جو کرید کرید کر اس سے سوالات کر رہا تھا۔

یعقوب بن شمعون نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا "ہمارا مورث اعلیٰ ایک ارمی تھا۔ ابراہیم پیغمبر۔ وہ عبر النہر کے اس پار کلدانیہ کے شہر اُر میں رہتا تھا۔ وہ اپنے خاندان کو لے کر وادی فرات سے نکلا اور قحط کے دنوں میں چراگاہیں تلاش کرتا پھرا۔ کنعان، مصر، پھر کنعان اور یعقوبؑ بن اسحٰقؑ بن ابراہیمؑ کے بارہ لڑکے ہوئے۔ اور یوسفؑ بن یعقوبؑ کو اس کے سوتیلے بھائیوں نے"

"مجھے سارا واقعہ معلوم ہے" پدما نے بے صبری سے کہا۔ رات تیزی سے گزر رہی تھی۔ اگر

مینائیل جلد از جلد کسی طرح دریائی راستے سے روکٹ تک پہنچا دیئے۔

"یوسفؑ کو" پیرمرد کہتا رہا "اسی ممفس کے بازار میں بیچا گیا۔ مگر خدا یوسفؑ کے ساتھ تھا۔ اور ـــــ"

"مجھے معلوم ہے" پدما نے کہا۔ "اور جوزف میرا مطلب ہے کہ یوسفؑ نبی کو منسٹر آف فوڈ اینڈ ایگریکلچر بنا دیا گیا تھا۔ میرا مطلب ہے۔ اور انہوں نے اپنے قبیلے کو کنعان سے بلا بھیجا اور"

"اور بنی[۱] اسرائیل مصر میں خوب پھولے پھلے اور ملک ان سے بھر گیا اور ایک نئے بادشاہ نے کہا بنی اسرائیل ہم سے زیادہ طاقتور ہوگئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بنی اسرائیل پر نگراں مقرر کئے جو ان سے کڑی محنت کرواتے اور انہوں نے فرعون کے لئے پتھوم اور عمیس کے شہر تعمیر کئے۔" یعقوب بن شمعون نے کہا۔

"اور بادشاہ[۲] مصر نے دو عبرانی دایاؤں سے جن کے نام شیفرہ اور پواہ تھے، کہا جب عبرانیوں کے یہاں لڑکے پیدا ہوں تو انہیں مار ڈالو۔" میری کرین نے بے اختیار انجیل مقدس کی اگلی عبارت دہرائی۔ اس کے میزبانوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تم کیا کہہ رہی ہو۔ یہ کب ہوا؟"

تب پدما میری نے سوچا۔ انہیں بتا دینا چاہیئے کہ ان کی نجات کا زمانہ دور نہیں۔ اس نے دریچے میں جا کر دیکھا۔ دور قصر عین الشمس میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں اس نے کہا۔ "پھر بادشاہ

---

[۱] عہدنامہ قدیم کتاب دوم۔ باب ۱ : ۱-۱۳

[۲] عہدنامہ قدیم کتاب دوم۔ باب ۱ : ۱۵-۱۶

رعمیس دوم نے۔ عبرانیوں کو حکم دیا اپنے سارے نوزائیدہ لڑکوں کو دریا میں ڈبو دیں۔"

"کیا ابھی ہم پر اور بلائیں نازل ہونے والی ہیں ۔۔۔؟" زوجہ یعقوب نے دہل کر پوچھا۔

"ہاں! لیکن ایک بچہ موشے بچ جائے گا اور وہ رعمیس دوم کے محل میں پلے گا۔ اور وہ تم کو مصر سے نکال لے جائے گا۔"

عبرانیوں نے مبہوت ہو کر اسے دیکھا۔ "لڑکی کیا تم کاہنہ ہو۔۔۔؟ غیب کا علم جانتی ہو۔۔؟"

یہی سمجھ لو اور سنتے جاؤ۔ یہاں سے نکل کر تم بنی اسرائیل کنعان میں سلطنت قائم کرو گے۔ پھر اشوریہ کے بادشاہ تم کو قید کر کے بابل لے جائیں گے۔ تم توراۃ کے صحائف لکھو گے ایران کا شاہ سائرس تمہیں آزاد کر کے فلسطین بھیج دے گا، تمہارے ہاں داؤد بادشاہ کی نسل میں یسوع پیدا ہو گا۔"

پدملا نے غیر ارادی طور پر صلیب کا نشان بنایا۔ متحیر عبرانی اسے تکتے رہے اس نے کہا۔ رومن تمہیں جلاوطن کریں گے۔ تم ساری دنیا میں مارے مارے پھرو گے۔ پھر آج کی رات سے پورے سوا تین ہزار سال اور ولادت مسیح سے ۱۹۴۸ برس بعد تم اسی کنعان میں نئی حکومت قائم کرو گے۔ اور جس طرح تم کو دوسری قوموں نے جلاوطن کیا تھا۔ تم عربوں کو ان کے وطن سے نکال دو گے۔"

"عرب کون۔۔؟" میخائیل نے دریافت کیا۔

پدملا نے اکتا کر اپنے دور کی عالمی سیاست سے اسے مختصراً آگاہ کیا۔ میخائیل نے جو بڑے دھیان سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس سے پوچھا۔ "تمہاری سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ تم روشنی کی رفتار سے تیز تر پرواز کر کے ارضی وقت کی حدود سے باہر ماضی میں پہنچ گئیں۔ اس کے آگے کیا ہو گا۔۔؟"

پدما نے گھڑی دیکھی: "مجھے کچھ معلوم نہیں میخائیل۔ لیکن مجھے جلدی سے شہر پناہ کے باہر پہنچا دو۔"

رات گزر چکی تھی اور دریائے نیل پر اُجالا پھیل رہا تھا۔

"ہمیں بھی اپنے ساتھ اپنے وقت میں لے چلو۔" عبرانیوں نے اس سے التجا کی۔

"نہیں۔" پدما نے دل اکڑا کر جواب دیا۔ "یہ ممکن نہیں ہم اپنے اپنے وقت سے آگے یا پیچھے نہیں جا سکتے۔ اپنے اپنے دور کی آزمائشیں سہنا ہمارا مقدر ہے۔ ہم تاریخ کو آگے یا پیچھے نہیں سرکا سکتے۔ کاش — وہ سب ہوتا جو ہونا چاہیئے تھا۔ میں اسرائیل کی بنیہ دبورہ کی طرح تم کو یہ سب بتا رہی ہوں۔ دبورہ چند صدیوں بعد تمہارے ہاں پیدا ہوگی۔ مگر جس زمانے سے میں آئی ہوں وہ انبیاء کے بجائے سائنسدانوں کا دور ہے۔" عبرانی کنبہ اب آنسو بہا رہا تھا۔ صرف میخائیل چہرہ سخت کئے دیوار سے لگا کھڑا رہا۔ پدما نے تاسف سے اسے دیکھا۔

دروازے کی کنڈی کھڑکی۔ وہ سب دم بخود رہ گئے۔ یعقوب کی بیوی نے پدما کو ایک کمبل میں چھپا دیا۔ میخائیل نے کواڑ کھولا۔ دہلیز پر امیرزادہ ٹوٹ کھڑا تھا۔

...

ٹوٹ نے عبرانیوں سے کہا: "چراغ بجھا دو۔" اور میری سے مخاطب ہوا: "میں شاہی دعوت میں شریک تھا۔ جب میرے ایک خادم نے آکر میرے کان میں چپکے سے کہا کہ آسمانی دوشیزہ غائب ہوگئی۔ ایک پہریدار نے اسے عبرانیوں کے محلے کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ میں نے خادم کو حکم دیا کہ اپنی زبان بند رکھے اور سیدھا یہاں آ رہا ہوں۔ تم نے مجھے کل صبح کو نہ بتایا چپکے سے بھاگ گئیں۔ فرعون سمیت سارا دربار اور فوجی افسر نشے میں دھت پڑے ہیں۔ مگر تمہیں ڈھونڈ نکالنے میں

اُنہیں دیر نہ لگے گی اور اگر ان کو شبہ ہو گیا کہ تم اشوری جاسوس ہو۔ پتھر سے باندھ کر نیل میں ڈبو دیں گے۔ اپنے متعلق سچ سچ بتا دو شاید میں تمہیں بچا سکوں "

پدما اور عبرانیوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ عبرانی ذہنی ارتقار کی اونچی سطح پر پہنچ چکے تھے اور پدما کے متعلق سمجھ گئے تھے۔ لیکن بے چارہ ثوث۔ اتون اور رَع اور جانور کا پجاری۔ صحیفہ متوفین کا کاتب۔ موت کا پرستار۔ بعید ترین مستقبل کے متعلق اس کی عقل میں کیا آئے گا۔ پدما نے میخائیل کو دیکھا۔

میخائیل نے آہستہ سے کہا۔ "بتا دو حد سے حد یہ تم کو ایک کاہنہ یا ساحرہ تصور کر لے گا۔ ورنہ شاید یہ بھی تم کو فرعون کے حوالے کر دے۔"

پدما نے چند الفاظ میں ثوث کو بتایا بڑی حیرت کی بات تھی۔ ثوث سمجھ گیا۔ دو تین منٹ خاموش رہا۔ پھر بولا۔ "چلو میں تم کو تمہاری ٹائم مشین تک پہنچائے دیتا ہوں۔"

جس وقت وہ عبرانیوں کو خدا حافظ کہہ کر مکان سے نکلی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ وہ ان بے چاروں کو جن کی نسل میں موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور کارل مارکس اور سگمنڈ فرائیڈ اور آئین اسٹائین پیدا ہونے والے تھے۔ ۱۳۱۵ ق۔ م کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بے یار و مددگار چھوڑ کر ثوث کے اسپ تازی پر سوار ہو گئی۔ شاید اسی وجہ سے انسان کو یہ صلاحیت نہیں دی گئی ہے کہ وہ آگے یا پیچھے دیکھ سکے۔ ورنہ رو رو کر مر جائے پدما نے سوچا۔

جس وقت وہ دونوں نخلستان میں پہنچے سورج نکل آیا تھا۔ راکٹ کھجور کے سامنے کھڑا دمک رہا تھا۔ پدما کی جان میں جان آئی۔ لیکن عین اس وقت فصیل شہر کی طرف سے گرد و غبار کے بادل اُٹھے۔

فرعون کے شہوار نیزے چمکاتے اس کے تعاقب میں اڑے چلے آرہے تھے۔ پدما لپک کر ردکٹ کی سیڑھیاں چڑھ گئی اور دروازہ کھولا۔ ثوث نیچے کھڑا رہ گیا۔ وہ گھبرا کر چلا رہا تھا۔ مجھے ساتھ لے چلو۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ تمہیں فرار ہونے میں میں نے مدد کی ہے۔ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔" پدما نے لوکھلا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اندر کھینچ لیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ پدما نے ۱۹۶۷ء کا بٹن دبا دیا۔

ردکٹ ڈاکٹر کرین کے بنگلے کے لان پر اُترا۔ وہ دونوں باہر نکلے۔ صبح کے سات بجے تھے ابھی چاروں طرف سناٹا تھا۔ پدما نے جلدی سے ردکٹ کو خالی موٹر خانے میں منتقل کیا۔ گم صم ثوث سبزے پر کھڑا حیرت سے گرد و پیش کو تک رہا تھا۔ دھاری دار اطلسی لنگی، چوڑا طلائی کنٹھا۔ بالوں کے چوکور پٹے۔ عجیب مسخرا لگ رہا تھا۔ پدما کا دل ڈوب گیا۔ یہ بے چارہ یہاں کیا کرے گا۔ وہ اسے ساتھ لے کر بنگلے میں گئی۔ خوش قسمتی سے دونوں چھوٹے بھائی ایسٹر کی تعطیلات میں کوچین گئے ہوئے تھے۔ ملازم صبح دس بجے آتا تھا۔ وہ ثوث کو بھائیوں کے کمرے میں لے گئی۔ ان کا وارڈروب کھول کر اس کے ناپ کے کپڑے تلاش کئے۔ "لباس تبدیل کر لو۔ میں ناشتہ تیار کرتی ہوں۔" اس نے کہا اور ڈائننگ روم میں جا کر فریج میں سے مکھن انڈے نکالے، ٹوسٹر کا پلگ لگایا۔ برکولیٹر اٹھایا۔ صبح کا ٹائمز آف انڈیا دہلیز میں پڑا تھا۔ اس کی سرخیوں پر نظر ڈالی اور برقی اسٹوو جلا کر انڈے اُبالنے میں مشغول ہو گئی۔

"ہلو، گڈ مارننگ۔" اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ دروازے میں ثوث کھڑا تھا۔ ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس، انگلیوں میں سلگتا سگریٹ۔ امریکن لہجے میں: "بریکفاسٹ ریڈی؟" پوچھتا کرسی پر بیٹھا اور ٹائمز آف انڈیا کے مطالعے میں منہمک ہو گیا۔

واضح ہو کہ جس طرح ۱۲۱۵ ق۔م میں پہنچتے ہی ڈاکٹر پدما کرین قدیم ترین قبطی اور عبرانی سمجھنے پڑھنے اور بولنے لگی تھی امیر زادہ ثوث ۱۹۶۶ء میں داخل ہو کر انگریزی ملیالم اور ہندوستانی سے فی الفور واقف ہو چکا تھا۔

آگے قصہ کوتاہ کرتی ہوں۔ پدما نے اپنے حلقے میں ثوث کو ایک "مصری قبطی دوست" کی حیثیت سے متعارف کیا۔ "مصور ہیں۔ کلاسیکل مصری آرٹ کے استاد۔ میں ان سے امریکہ میں ملی تھی۔" پھر السید دکتور ثوث الہرمینز نے ٹریڈیشنل مصری تصویریں بنانا شروع کیں۔ جو دھڑا دھڑ بکیں۔ بمبئی میں آپ نے مکبالا ہل پر ایک فلیٹ کرائے پر لیا اور بہت جلد شہر کی متمول و مقبول شخصیت بن گئے۔ کسی ترکیب سے ایک گلف اسٹیٹ کا پاسپورٹ حاصل کر لیا۔ مغربی یورپ اور امریکہ کے کئی چکر لگائے عمر شریف کی طرح ہینڈسم۔ کامیاب، دولت مند، رومینٹک بھائی ثوث ٹھاٹھ کر رہے تھے۔

پدما بدستور جنوبی ہند کی اُس لیبارٹری میں ملازم تھی۔ سال بہ سال گزرتے گئے تو ایک روز اس کی ماں نے کہا۔ "تمہارا الیجپشن کو لیگ دوست شادی نہیں کرے گا کیا؟ سنا ہے بمبئی میں ہر وقت چھوکریوں میں گھرا رہتا ہے۔" پدما خاموش رہی ثوث کو اس سے ملاقات کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ کبھی سال دو سال میں اتفاقاً مل جاتا۔ کرسمس اور سالِ نو کے کارڈ البتہ پابندی سے بھیجتا بات دراصل یہ تھی کہ پدما معمولی شکل و صورت کی سیدھی سی لڑکی تھی۔ اور موسیو ثوث ہرمیز ایک گلیمرس جو حسیناؤں کے نرغے میں شاداں و فرحاں تھے۔ دوسری بات یہ کہ مرد چاہے وہ ۱۲۱۵ ق۔م کا ہو۔ چاہے ۱۹۷۳ء کا ذہنیت اس کی وہی رہے گی — بیہودہ —

یہ جون ۱۹۷۵ء کا ذکر ہے۔ پدما دو ہفتے کی چھٹی لے کر اپنی خالہ کے ہاں بمبئی آئی ہوئی تھی۔

اندر باندرہ میں ٹھہری تھی۔ ایک شام اس نے ثوث کی خیر خبر لینے کے لئے اسے فون کیا "اگر تم زیادہ مصروف نہ ہو تو کھانا ہم لوگوں کے ساتھ آکر کھاؤ۔"

"تم ہی آجاؤ۔" ثوث کی بیزاری آواز آئی۔ "میں اتنی دور باندرہ کہاں آتا پھروں گا۔"

بد دماغی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔ پدملنے سوچا۔ مگر وہ ثوث کو بہر حال اپنی ذمے داری سمجھتی تھی۔ ٹیکسی سے کر کیپا لاہل اولمپیا بلڈنگ پہنچی۔ وہ اپنے لگزری اپارٹمنٹ کے ڈرائنگ روم میں ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھا ۲۰۰۰ء کر رہا تھا۔ اسکرین پر مصر اور اسرائیل کے متعلق ایک مباحثہ ہو رہا تھا۔ پدما جاکر ایک صوفے پر ٹک گئی۔ ثوث اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ پھر دفعتہً ٹیلی وژن بند کر دیا۔ اور بولا۔ "میں مصر جاکر لڑنا چاہتا ہوں۔"

یوم کپر وار تو کافی پرانی بات ہو چکی۔" پدمانے آہستہ سے کہا۔

"رمضان وار۔" ثوث نے گرج کر تصیح کی۔

"اوکے۔ رمضان وار۔"

"میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں گا۔"

اس کے لئے غالباً اب تمہاری عمر نہیں ہے۔

"شٹ اپ!" اس نے اسکاچ وہسکی کا دوسرا گلاس بھرا۔

"ثوث تم شراب بہت پینے لگے ہو۔" پدمانے نرمی سے کہا۔

ثوث نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ "مجھ سے بیویوں کی طرح بات مت کرو۔"

"آئی بگ یور پارڈن۔" اب پدما کو واقعی غصہ آگیا۔

"سوری! — پدما۔ آئی ایم سوری" ثوث نے دھیرے سے کہا۔ وہ بہت آزردہ نظر آرہا تھا۔

"ثوث — بنی۔ آخر بات کیا ہے — پدما نے لجاجت سے دریافت کیا۔

"بتاؤں۔" اس نے رُک کر کہا" بات یہ ہے پدما کہ مجھے اپنا وقت یاد آرہا ہے۔ میں اپنے وقت میں واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"اپنے وقت میں —!" پدما نے حیرت سے دہرایا۔" یہ زمانہ چھوڑ کر —؟"

"یہ زمانہ —!! اس میں کون سے سرخاب کے پَر لگے ہیں" اس نے تلخی سے کہا اور پھر ٹیلی وژن کھولا۔ نیوز ریل میں دنیا بھر میں بپا جنگوں اور نسلی اور مذہبی فسادوں کے مناظر دکھائے جا رہے تھے۔" بتاؤ مجھ سے ساڑھے تین ہزار سال بعد تم کتنی متمدن ہو؟ ہم بنی اسرائیل پر ظلم ڈھاتے تھے اور اشوریہ سے لٹتے تھے تم سب ایک دوسرے کے ساتھ بے انتہا پیار محبت سے رہتے ہو۔ ہمارے فراعنہ ستم پیشہ تھے۔ تمہارے حکمران فرشتہ ہیں۔ ہم موت سے ڈرتے تھے تم موت کے خوف سے آزاد ہو چکے ہو۔ تم عالی شان مقبرے نہیں بناتے مردہ پرستی نہیں کرتے، نوحے نہیں لکھتے شعر و شاعری بھی ترک کر چکے ہو۔ تمہارے مذاہب، فلسفے، اخلاقیات، نفسیات —" وہ وہسکی کا گلاس میز پر پٹخ کر زور سے ہنسا۔" تمہاری دیومالا میں۔ نظریۂ تثلیث، روحانیت یہ، وہ سب مین سائنٹفک ہیں۔ تمہاری جنگیں ہیومنزم پر مبنی ہیں۔ تمہارا نیوکلیئر بم بھی خالص انسان دوستی ہے۔ ہے نا — ؟ تمہاری روشنی کی رفتار واقعی تیز ہے؟"

تم تھوڑی دیر کے لئے خود کو OUT OF TIME محسوس کر رہے ہو اور کوئی بات نہیں۔ چلو پکچرز ہو آئیں۔

"اوڈو دشٹ اپ۔ اینڈ لیومی الون۔"

"اوکے۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "گڈ نائٹ ثوث۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

"پدما۔" ثوث نے آواز دی۔ "پدما آئی ایم سوری۔"

"ٹھیک ہے ثوث۔"

"پدما یہاں آؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ سنو، بات یہ ہے کہ مجھے اپنے ماں باپ اور بہنیں یاد آرہی ہیں۔ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔ تمہارا وہ روکٹ وہ ابھی تمہارے موٹر خانے میں متقفل پڑا ہے نا۔"

"ہے تو سہی۔ میں اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتی ڈر لگتا ہے۔"

"مجھے اس میں واپس پہنچا آؤ۔ میں نے کافی مستقبل دیکھ لیا۔"

"تم زیادتی کر رہے ہو۔ ہم اتنے برے تو نہیں۔ یہ تمہارا وقتی موڈ ہے۔"

"ممکن ہے۔ مگر اصلیت یہ ہے کہ میں ہوم سِک ہوں۔"

"ٹائم سِک۔" پدما نے تصحیح کی۔ "اچھا جو تمہاری مرضی لیکن یاد رکھو۔ یہ روکٹ روشنی کی رفتار سے صرف چار مرتبہ سفر کرسکتا ہے۔ تم کو ممفس میں چھوڑ کر جب میں اس دفعہ واپس آؤں گی اس کے بعد تم دوبارہ یہاں نہ آسکو گے۔"

"منظور!" ثوث نے کہا۔

۱۳۰۶ ق۔م میں جھیل کے کنارے چرواہا اسی طرح بکریاں چرا رہا تھا۔ نو برس میں وہ جوان ہو چکا تھا۔ پدما اور ثوث کو روکٹ کی سیڑھیاں اُترتے دیکھ کر فوراً سجدے میں گر گیا۔ ثوث نے ۱۹۷۵ء سے روانہ ہوتے وقت اپنے پرانے کپڑے اور زیورات پہن لئے تھے۔ اور وہی پرانا امیرزادہ ثوث لگ

رہا تھا؛ شہر نہیں جاؤں گی میں۔ تمہارا بادشاہ پھر پکڑ لے گا۔"

جہاں پناہ قصر الشمس میں تشریف رکھتے ہیں یا تھینبر گئے ہوئے ہیں ؟" ثوث نے چرواہے سے دریافت کیا۔

"پچھلے فرزند ربیع رحلت فرما چکے۔" اس نے اہرام کی سمت اشارہ کیا، جہاں ایک نیا مقبرہ تعمیر کیا جا رہا تھا۔ "رعمیس دوم آج کل تھینبر میں رونق افروز ہیں۔"

"پدما! چلو تمہیں تھینبر دکھا لاؤں۔ نیا بادشاہ طبعاً بے رحم ہے۔ لیکن میرے ساتھ کا کھیلا ہوا ہے۔ تم کو کوئی گزند نہ پہنچائے گا۔ اور اپنی ملکہ پر عاشق ہے۔ دوسری شادی کی بھی نہیں سوچے گی چلو کل پرسوں واپس آجانا۔"

وہ بجرے پر سوار ہو کر تھینبر روانہ ہوئے ثوث اپنے وقت میں واپس آکر واقعی بے حد خوش اور مطمئن نظر آرہا تھا۔ دریا پر دور سے فلک بوس محلات نظر آئے۔

"یہ اسوان ڈیم میں ڈوب چکے ہیں۔" ثوث نے پدما کو یاد دلایا۔

بہت سے بچا بھی لے گئے ہیں۔" پدما نے فوراً جواب دیا۔ ملکہ ہالتشیپت، طوطمس سوم، سیتی اوّل، ہور دبا اور رمین تاہ کے عظیم الجثہ مجسموں کے نیچے سے گزرتا ہوا بلط نما بجرہ سمر پیلس کی ــــ سیڑھیوں سے جا لگا۔ ثوث کے والدین، بہنیں اور شاہی خاندان کے چند افراد سامنے وسیع دالان میں کرسیوں پر نیم دراز خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وہ موسم گرما کی ایک سست خرام، کاہل سہ پہر تھی اور دھوپ دریائے نیل پر سے اُترتی جا رہی تھی۔ ثوث نے ان سب سے کہا کہ دیبی جانور کا حکم نہیں کسی کو بتائے کہ وہ دوشیزہ فلک کے ساتھ اتنے عرصے کہاں غائب رہا۔

چوتھے دن وہ تھیبز سے روانہ ہوئی۔ ثوث اسے نخلستان تک پہنچانے آیا جھیل کے کنارے انہوں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، پدما سکتے میں رہ گئی کھجوروں کے سامنے روکٹ موجود نہ تھا۔ پدما کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ زمین پاؤں تلے سے نکل گئی اور وہ وہیں ریت پر بیٹھ گئی۔ ثوث سراسیمگی سے نخلستان کے گرداگرد دیکھ آیا۔ چرواہوں کو آواز دی۔ سپاٹ رتیلے میدان میں روکٹ کا کہیں دور دور پتہ نہ تھا۔ ثوث پدما کے پاس آیا وہ ریت پر سرنگوں بیٹھی تھی۔ ثوث کی نظر قریب کے ایک پتھر پر پڑی۔ اس کے نیچے پیاپرس کا ایک زرد ٹکڑا دبا ہوا تھا۔ ثوث نے اسے کھینچ لیا۔ پڑھا اور پدما کو دے دیا۔ عبرانی میں لکھا تھا۔

مریم بنت ابراہیم۔

شالوم علیخم۔

کل دوپہر فرعون علیہ ملعنہ کے مقبرے کے لئے پتھر ڈھوتے ہوئے مجھے اتنے کوڑے لگائے گئے کہ میں جان بلب ہوکر پانی کے لئے گھسٹتا گھسٹتا اس جھیل پر آیا اور یہاں تمہارا روکٹ فرشتۂ رحمت کے مانند جگمگاتا دیکھا۔ نو برس قبل اس رات تم نے مجھ سے جو کچھ بتایا تھا سب رتی رتی مجھے یاد ہے، زیر تعمیر مقبرے کے مصری انجینئر تین چار دن سے آپس میں تذکرہ کر رہے ہیں کہ دوشیزۂ فلک امیر زادہ ثوث ہرمیز کو واپس لے آئی ہے۔ اور تھیبز گئی ہوئی ہے۔ اس سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ ابھی تم شاید چند روز یہاں قیام کرو گی۔ تم نے یہ بھی کہا تھا کہ رعمسیس دوئم کے عہد میں موسیٰ پیدا ہوں گے۔ اور کیا معلوم اس وقت جبکہ میں تم کو یہ سطور لکھ رہا ہوں وہ ہمارے محلے کے کسی گھرانے میں پیدا ہو چکے ہوں لیکن ان کے بڑے ہونے اور ہمارے ایکزوڈس میں ابھی بہت دیر ہے، کیا جانیے کب

ہو گا۔ اور کیا ہو گا۔ میں اب اگر شہر واپس جانا چاہوں، عبرانی غلاموں کا نگران اعلیٰ جو میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ مجھے ریت میں زندہ دفن کر دے گا. لہٰذا جانِ عزیز بچانے کے لئے تمہارے روکٹ پر بیٹھ کر تمہارے وقت میں جا رہا ہوں۔ سب سے پہلے نیویارک جاؤں گا جس کے بارے میں تم نے مجھے اس رات بتایا تھا۔ اس کے بعد اسرائیل وہاں سٹیبل ہوتے ہی فوراً جلد از جلد خدائے ابراہیمؑ و اسحٰقؑ کی قسم میں یہاں آکر تم کو تمہارے وقت میں لے جاؤں گا۔ جو آج سے میرا وقت بھی ہے۔

تمہارا بھائی

میخائیل بن حنان بن لیعقوب

(آج سے مائیکل۔ ایچ۔ جیکب عرف مائیک)

پرچہ پدما کے ہاتھ سے ریت پر گر گیا اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور چکرا کر گرنے لگی۔ ٹوٹ نے اسے فوراً سنبھالا۔ "پدما"، اس نے لکھا ہے، تم کو لینے واپس آئے گا، گھبراؤ نہیں میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ ایماندار، راستباز لڑکا ہے۔ یاد کرو میں بھی اپنی جان بچانے کی خاطر تمہارے ساتھ بھاگ نکلا تھا۔ وہ ضرور واپس آئے گا۔

"ٹوٹ —" پدما میری نے آہستہ سے کہا "۱۹۷۵ء سے روانہ ہوتے وقت میں نے تم کو بتایا تھا۔ یہ روکٹ روشنی کی رفتار سے آگے صرف چار مرتبہ پرواز کر سکتا ہے۔"

پُرانی کہانی

یہ جوان گنت اندھے فقیر ہمیں سڑکوں کے کنارے کنارے چلتے۔ درختوں اور شکستہ دیواروں کے سائے میں بیٹھے المونیم کا میلا کٹورا ہاتھ میں لئے بھیک مانگتے نظر آتے ہیں، کبھی ہم نے اپنا روشن راستہ طے کرتے ہوئے ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک کر سوچا ہے کہ ان کی زندگی کی کہانی کیا ہوگی؟ یہ کہاں پیدا ہوئے؟ ان کے ماں باپ کون تھے؟ گھر بار کیسا تھا؟ انہوں نے کب اور کس طرح آنکھیں کھولیں؟ کب سے اس طرح ٹٹول ٹٹول کر چلتے ہوئے، گگھیا گگھیا کر خیرات مانگ رہے ہیں اور ایک دن اسی طرح مر جائیں گے۔ یعنی ایک گمنام اندھیرے سے نکل کر دوسرے گمنام اندھیرے میں داخل ہو جائیں گے۔ اور ان کی زندگی اور موت سے کسی کے لئے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جوان اندھی بھکارنیں رجن کے متعلق آج سے تیس چالیس برس قبل بڑے رومانٹک افسانے لکھے جاتے تھے) ہاتھ میں لمبی تسبیح لئے سفید کرتا پہنے نابینا حافظ، اگربتیوں کے پیکٹ یا مدینہ

متورہ کی چھوٹی چھوٹی تصویریں سنبھالے اندھے تلسی مالائیں پہنے، رام نام کا واسطہ دیتے سُورداس پھٹا پرانا کوٹ پتلون پہنے وائلن بجاتے عیسائی بھکاری، چلتی ٹرین میں چڑھ کر ولدوز آواز میں نعتیں پڑھتے یا دو تارہ بجا کر بھیک مانگتے بشرٹ اور پتلون میں ملبوس بے بس، مسکین چہروں والے نوجوان اندھے، سفید رنگ کی چھڑی سنبھالے خاموشی سے اِدھر اُدھر چہرہ گھما کر سڑک کے خطرناک ٹریفک میں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے اندھے۔ پُلیا کے نیچے یا عالی شان کوٹھیوں کے پھاٹک پر صبر کے ساتھ سامنے پھیلی چادر پر سکوں کے گرنے کی آواز سننے کے منتظر اندھے، مندروں اور درگاہوں کے احاطے پر نعرے لگاتے اندھے۔

مشرقی ممالک کے ان لاکھوں اندھوں کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ نہ کسی کو ان کے متعلق سوچنے کی فرصت ہے۔ اندھے ہمارے سماجی پس منظر کا اتنا ہی لازمی حصہ ہیں جتنے کوڑھی، فٹ پاتھ پر سونے والے مرد اور عورتیں اور گلیوں اور سڑکوں پر آوارہ پھرنے والے فاقہ کش بچے ہمارے معاشرے کا جزو ہیں۔ ہم ان کی طرف دھیان بھی نہیں دیتے۔

اتفاق سے ایک اندھے فقیر کی کہانی میں جانتی ہوں اور آپ کو سنانا چاہتی ہوں۔ یہ اندھا فقیر جو برسوں دہرہ دون کی ایک بے حد پُرفضا سڑک کے کنارے جس کے ایک طرف خوبصورت کوٹھیاں تھیں اور دوسری طرف شفاف پانی کی شور مچاتی پہاڑی نہر بہتی تھی۔ بیٹھا بھیک مانگتا رہتا تھا۔ جب پالا گرتا تب بھی اور جب تیز دھوپ میں کولتار کی سڑک پر دھواں سا اٹھتا تھا تب بھی وہ ایک نیلے پتھر پر کشمیری نمدے کا ایک غلیظ اور کرم خوردہ ٹکڑا بچھائے ساکت بیٹھا رہتا تھا۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہاتھ پھیلا کر اللہ۔ اللہ۔ کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی جگہ جو

سُرخ دھنسے ہوئے ڈھیلے سے تھے وہ دائیں بائیں گھومتے رہتے تھے اور اس کی بکرے کی ایسی داڑھی ہلتی رہتی تھی۔ وہ ہر بوڑھے اندھے بھکاری کی طرح بہت ہی غلیظ گھناؤنا اور بدہیئت بوڑھا اندھا بھکاری تھا۔

" کھدمت گار۔ خانساماں جی آئے ہیں ؛" روز صبح نو بجے پچھلے برآمدے میں ایک ڈپٹ دار آواز سنائی دیتی۔ اس کے بعد خانساماں جی بوٹ سیڑھیوں میں اُتارتے۔ مودبانہ انداز سے چق اٹھا کر سفید موزوں میں دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوتے اور تقریباً فرشی سلام کرنے کے بعد بغل سے رجسٹر نکال کر سودے کا حساب پیش کرتے۔ یہ رجسٹر خانساماں جی کی ہستی کی طرح انوکھا تھا۔ اور میں خانساماں جی سے فرمائش کرتی تھی کہ وہ مجھے اس کے مطالعے سے بہرہ ور ہونے کی اجازت دیں۔ خانساماں ایسے رسم الخط میں حساب لکھتے تھے جو قدیم مصری رسم الخط کا ہم پلہ تھا۔ اور انہوں نے خود ایجاد کیا تھا۔ مثلاً گوشت کے لئے بکرے کی تصویر مرغی انڈے، گاجر، چقندر، آلو وغیرہ کے لئے ان کی تصاویر۔ روپے آنے پائی اور سیر پاؤ چھٹانک کے لئے بہت پُراسرار نشانات انہوں نے خود مقرر کئے تھے، حساب میں اگر کسی شخص کا نام لکھنا ہو تو اس کی جگہ اس کی شکل بنا دی جاتی۔ اپنی تصویر وہ بڑی تفصیل سے بناتے تھے۔

خانساماں جی کے اصل نام سے کوئی واقف نہ تھا۔ ان کا اور ان کی بیوی اللہ دی کا ہم لوگوں سے تعارف بُدھن کے ذریعے ہوا تھا۔ جو خورجے کی ایک خاتون تھیں اور کبھی کبھار دوپہر کے وقت ہماری طرف آنکلتی تھیں اور برآمدے کے فرش پر دھوپ میں لیٹ کر " رنگ لاتی ہے ۔ حنا پتھر پر پس جانے کے بعد،" الاپا کرتی تھیں۔ بُدھن جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ سلائی کر کے اپنا

پیٹ پالتی تھیں۔ ایک روز ان کے ساتھ ایک بوڑھی خاتون بھی آگئیں جنہوں نے سرخ "زنگ کا دوپٹہ "کیلے" کی قمیض اور گلابی رنگ کا تنگ پائجامہ پہن رکھا تھا اور کلائیوں میں ہری ہری فیروز آبادی چوڑیاں کھنکھنا رہی تھیں۔ "بدّھن نے تعارف کرایا کہ یہ اللہ دی ہیں اور ان کے میاں خانساماں جی صاحب لوگوں کے یہاں بڑے معرکے کا کھانا پکاتے ہیں۔ مگر آج روز گار سے نہیں ہیں۔

اس کے چند روز بعد خانساماں جی ہمارے ہاں یہاں کام کرنے کے لئے آگئے۔ خانساماں جی ایک بہت بڑا چوبی صندوق بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے اپنی کوٹھری میں بڑے قرینے سے ایک طرف رکھ کر اس پر کڑھا ہوا میز پوش بچھا دیا۔ دیواروں پر انگریز بچوں کی تصویریں لگائیں۔ اور کاغذی پھولوں والا ایک گلدان بھی طاق میں سجا دیا۔ اللہ دی ایک بے حد سلیقہ مند خاتون تھیں اور اپنی کوٹھری کو آئینے کی طرح صاف رکھتی تھیں۔ میاں بیوی لاولد تھے اور ایک دوسرے کے لئے وقف۔ شوہر کی خدمت اور پرستش تو خیر اللہ دی کا فرض تھا۔ مگر خانساماں جی بھی بیوی کو بہت چاہتے تھے وہ خود جتنے ذہین تھے اللہ دی اتنی ہی بے وقوف تھیں اور خانساماں جی بڑے پیار سے ان کی مختلف حماقتوں کا ذکر کرتے تھے۔

خانساماں جی پیٹ بھر کے بدقطع تھے۔ چپٹی ناک، بے حد کالا رنگ، بہت بڑی توند، کبڑی ٹانگیں، چکی داڑھی، ہنستے تو باچھیں کانوں تک پھیل جاتیں۔ بے حد خوش مزاج تھے۔ کسی زمانے میں پیری مریدی بھی کر چکے تھے۔ گنڈے تعویز کے استاد تھے۔ اور صاحب لوگوں کے ساتھ انگلستان تک ہو آئے تھے۔ رنگون اور مانڈلے اور مدراس اور پونا تو ان کے لئے کوئی بات ہی نہ تھی۔ لندھور کی داستان ان کی پسند کی داستان تھی۔ خالقِ باری زبانی یاد تھی۔ جب ان سے کہا جاتا خانساماں جی

خالق باری ہو جائے تو وہ فوراً صافہ اتار سر پر ہاتھ پھیرتے۔ دوبارہ صافہ پہنتے اور کھنکار کر شروع کرتے۔

کمالک باری سرجن ہار   واحد ایک بٹا کتار!

اسم اللہ خدا کا ناؤں!   گرما دھوپ سایہ چھاؤں

رسول پیغمبر جان لبیت   یار دوست بولے جو بیت

خانساماں جی کے سرٹیفکیٹوں پر ۱۸۹۹ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک کی تاریخیں پڑی تھیں۔ اور انگریز فوجی اور سول افسروں کی ان "چٹھیوں" سے (جن میں سے اکثر کے کاغذ پیلے اور شکستہ اور روشنائی مدھم ہو چکی تھی) ہندوستان کی کولونیل سماجی تاریخ کے ایک معنی خیز باب پر روشنی پڑتی تھی۔

ایک روز مجھے کسی شرارت پر بہت زبردست ڈانٹ پڑی تھی اور میں پہلو کے سنسان برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی چپ چاپ زار و قطار رونے میں معروف تھی۔ اتنے میں خانساماں جی ادھر سے گزرے۔ ٹھٹھک کر مجھے دیکھا اور آگے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد آنسوؤں کی جھلملاہٹ میں سے مجھے سبزے پر گلابی دوپٹہ لہراتا نظر آیا اور اللہ دی قریب آگئیں اور مجھے بڑی ملائمت سے اپنی کوٹھری میں مدعو کیا۔ میں آنسو پونچھ کر خاموشی سے ان کے ساتھ ہولی۔

کوٹھری میں خانساماں جی اپنا سیاہ چوبی صندوق کھولے میرے منتظر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے صندوق کا سامان نکال کر فرش پر پھیلا دیا اور بڑی تندہی سے کچھ تلاش کرنے لگے۔

صندوق میں سے جو تام جھام نکلا وہ میرے لئے بہت پُر اسرار ثابت ہوا۔ پرانے فیشن کے جھالر دار فراک۔ سمور کے شکستہ کوٹ اور ریشمیں سائے۔ طرح طرح کی ٹوپیاں۔ چینی کے برتن۔ ٹوٹی ہوئی گھڑیاں اور ٹائم پیس۔ جاپانی پنکھیاں۔ مالائیں۔ بروچ۔ باتصویر انگریزی کتابیں۔ آرائش کا دقیانوسی

سامان اور سُرخ ریشمیں رومال میں لپٹا سرٹیفکیٹوں کا پلندہ۔ خانساماں جی نے بتلایا کہ یہ ساری چیزیں ان کو ان کے مختلف صاحب میم لوگ نے ولایت جاتے وقت اپنی نشانی کے طور پر دی تھیں۔ اور ان کا سرمایہ حیات تھیں۔

"پہلے وقتوں کا صاحب بہت نیک ہوتا تھا بٹیا" انہوں نے کہا، "مگر یہ جب سے کانگریس نے شور مچایا ہے صاحب لوگ بھی بدل گیا ہے۔" ڈھونڈ ڈھانڈ کے انہوں نے ایک پڑی سی سوتی جاگتی انگریزی گڑیا نکالی۔ اسے بڑی احتیاط سے جھاڑ پونچھ اور ادب سے میرے سامنے رکھ دیا۔ میرا جی چاہا کہ لپک کر گڑیا اٹھا لوں مگر خیال آیا کہ ڈانٹ پڑے گی۔ خانساماں جی اور اللہ دی مجھے بڑی پُر امید نظروں سے دیکھتے رہے۔ آخر ہچکچاہٹ کے ساتھ میں نے گڑیا اُٹھائی اور گھبراہٹ کے مارے شکریہ ادا کئے بغیر جلدی سے باہر بھاگ آئی۔

اس کے بعد جب بھی خانساماں جی اس عمرِ عیار کی زنبیل کو اپنے برآمدے میں دھوپ دیتے تو میں جا کر وہاں بیٹھ جاتی اور وہ ان پرانی دھرانی چیزوں سے وابستہ اپنی کہانیاں سنایا کرتے۔ یہ الّم غلّم ان کے لئے بالکل بے کار تھا مگر وہ اسے حرزِ جاں بنائے تھے۔

ہم لوگ دہرہ دون سے لکھنؤ آنے والے تھے۔ مگر خانساماں ساتھ چلنے پر راضی نہ ہوئے۔ کیونکہ اللہ دی بیمار رہنے لگی تھیں، اور پردیس جانے پر آمادہ نہ تھیں۔ خانساماں جی کو ہم لوگوں سے جدا ہونے کا بڑا قلق تھا۔ مگر انہوں نے کہا، "اس نیک بخت نے ساری عمر ہرج مرج میں میرا ساتھ دیا ہے۔ جوانی میں میں نے اس کے دل کو بہت بھاری دکھ بھی پہنچائے ہیں۔ اب آخری وقت میں اس ستونتی کی بات کیسے ٹال دوں؟" اس کے بعد آنکھیں پونچھتے کشمیری نمدہ اُٹھائے رجو انہوں نے نشانی کے

طور پر مانگا تھا، وہ شاگرد پیشہ کی طرف چلے گئے۔

جس روز ہم دہرہ دون سے روانہ ہونے والے تھے اور سارا سامان مال گاڑی پر لادنے کے لئے اسٹیشن بھیجا جا چکا تھا۔ خانساماں جی کہیں سے ایک چھوٹا سا ٹھیلہ لے آئے۔ چوبی صندوق ہوں ہوں کرتے ہوئے اس پر چڑھایا اور بڑی احتیاط سے نمدہ اس کے اوپر بچھا دیا۔ اللہ دی صندوق کا کنڈا پکڑ کر ٹھیلے پر چڑھیں اور اپنے گلابی دوپٹے کا گھونگھٹ کاڑھ کر بندریا کی طرح صندوق پر بچھے نمدے پر بیٹھ گئیں۔ خانساماں جی نے "یا غوث اعظم" کا ہلکا سا نعرہ لگایا اور سر جھکائے ٹھیلہ دھکیلتے پھاٹک سے باہر نکل گئے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے دوڑی مگر وہ سر جھکائے ٹھیلہ دھکیلتے کرزن روڈ پر بہت دور نکل چکے تھے۔

تین سال نکل گئے۔ ہم لوگ کچھ عرصے کے لئے دہرہ دون گئے ہوئے تھے۔ ایک روز کرن پور کے محلے میں اپنے عزیزوں کے یہاں اتوار منا رہی تھی۔ ان کا مکان بڑا پُراسرار تھا۔ برابر میں دو آنگن، اس کے ساتھ مسجد اور امام باڑہ۔ لمبے لمبے کمرے جن کے اونچے روشن دان پیچھے صاف ستھری گلی میں کھلتے تھے۔ روشندانوں کے شیشے نیلے اور نارنجی اور سبز تھے۔ دوپہر کو جب ان سے ایک طویل کمرے میں دھوپ آتی تو لگتا جیسے یہ کمرہ سمندر کی تہہ میں ہو۔ پانی کی لہریں دیوار پر جھلملاتی ہوں۔ اس کمرے میں ایک قطار میں پلنگ بچھے تھے اور میں ہم سن ساتھیوں کے ساتھ پلنگوں اور الماریوں پر کود کود کر ادھم مچانے میں مشغول تھی کہ دفعتاً گلی میں سے آواز آئی "تحفہ کباب — تحفہ کباب لے لو — تحفہ کباب" — پھر وہ آواز دور چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد ایک بچہ تام چینی کی میلی سی رکابی میں سیخ کے کباب لئے اندر آیا "باجی۔ لیجئے

کباب ؟" اس نے ایک الماری پر چڑھ کر رکابی میری جانب بڑھائی۔ میں نے دوسری الماری کی چھت پر سے ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی تو پلیٹ نیچے گر گئی۔ برابر کے کمرے سے کسی آپا نے ڈانٹا۔

"یہ کیا ہلڑ ہو رہا ہے۔؟"

"کبڑا کبابی باجی کے لئے کباب لایا ہے۔" بچے نے جواب دیا۔

"تو لے لو اور اسے پیسے دے آؤ۔ آپا نے آواز دی۔

"وہ پیسے نہیں لیتا۔"

میں اتنی دیر میں الماری سے کود کر امرود کے درخت پر چڑھنے کے ارادے سے باہر نکلی تو برابر کے کمرے سے انہی آپا نے مجھ سے کہا۔ بقاتن بوا سے کہو کبابیئے کو پیسے دے دیں۔" چنانچہ میں بقاتن بوا کو پکارتی پچھلی ڈیوڑھی کی طرف گئی۔ ڈیوڑھی میں کیا دیکھتی ہوں کہ خانساماں جی میلے چکٹ کپڑے پہنے لپا چپ چھوٹی سی انگیٹھی دہکاتے ہوئے آواز لگا رہے ہیں۔" ارے میری بٹیا کے لئے کباب لے جاؤ گرما گرم۔"

" خانساماں جی۔" میرے منہ سے نکلا۔ انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ باچھیں کانوں تک پہنچ گئیں۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور جلدی سے ہاتھ جوڑ کر بولے۔

"آج ہی میں نے بقاتن بوا کے لونڈے سے سنا کہ ٹبیا نخلو سے آئی ہیں۔ سو میں کباب لے کر حاضر ہو گیا۔" اتنا کہہ کر تندہی سے سیخ کباب الٹنے پلٹنے میں مصروف ہو گیا اور میں متعجب اور اداس ان کو دیکھتی رہی اور سوچنے لگی کہ اتنے ٹھاٹ باٹ اور آن بان کے خانساماں جی کو بازاری کبابیہ بنتے ہوئے کس قدر تکلیف ہوئی ہو گی۔

"مگر آپ نوکری کیوں نہیں کرتے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ لوگوں کے جانے کے بعد کولاگڑھ میں ایک صاحب کے یہاں کام ملا تھا مگر اسے معلوم ہوا کہ گھروالی کو بڑی بیماری ہے اس نے چھٹی دے دی۔"

"اللہ دی کیسی ہیں اب؟"

"گذر گئی" انہوں نے دھویں سے سیاہ ٹوٹے ہوئے پنکھے سے انگیٹھی دہکاتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر ایک اور میم کے یہاں کام ملا۔ مگر وہ جھک جھک بہت کرتی تھی۔ اس نے گالی دی۔ ڈیم بلاڈی باسٹرڈ نگر۔ بلیک مین۔ میں نے کہا۔ سلام۔ اور چلا آیا۔ بٹیا اب اس سفید داڑھی کے ساتھ انگریز کی گالی نہیں سہی جاتی۔"

"مگر اللہ دی" میں نے پھر کہا۔

"مرگئی نیک بخت۔ خیراتی اسپتال میں ڈالا۔ مرگئی تو توپ دیا۔ اب اکیلی جان کے لئے کیا غلامی کروں۔ اتنا بوڑھا ہوگیا ہوں بٹیا۔ سجھائی بھی کم دیتا ہے۔ اب مجھے کون نوکر رکھے گا؟"

"اور آپ کا وہ صندوق" وہ الف لیلوی صندوق۔ میں نے دل میں اضافہ کیا۔

"اللہ دی کی بیماری کا خرچہ بہت تھا بٹیا۔ جب کہیں سے پیسے ادھار نہیں ملے تو ساری پیٹی کباڑی کے ہاتھ اونے پونے بیچ دی۔ یہ لیجئے گرما گرم۔ تحفہ کباب۔"

میں ستمبر ۱۹۴۷ء میں چند روز قبل مسوری سے واپس آئی تھی۔ اور ایسٹرن کنال روڈ پر خوبصورت بیلی راج کے برآمدے میں اخبار میں تقسیم کی تفصیلات اور ہندو پاکستان کا نیا نقشہ دیکھنے میں مصروف

تھی۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اور ریڈیو پر مسوری کے فسادات کی خبریں آ رہی تھیں۔ اتنے میں دور پھاٹک پر ایک ہیولا سا ڈولتا نظر آیا۔

"جاؤ اسے اکنی دے آؤ" میری میزبان بیگم نے ملازم سے کہا۔ ملازم نے چند منٹ بعد واپس آ کر کہا کہ وہ اندھا فقیر مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔

"مجھ سے ۔۔؟ میرا دل ڈوب سا گیا۔ میں جلدی سے باہر نکلی۔ نابینا بھکاری آنکھوں کے سرخ ڈھیلے دائیں بائیں گھماتا پھاٹک پر چپ چاپ کھڑا تھا۔

"خانساماں جی۔" میں نے بھاگتے ہوئے قریب جا کر کہا۔ وہ لاٹھی سے ٹٹولتا ٹٹولتا آگے بڑھا، بجری پر بیٹھ کر میرے پاؤں پکڑ لئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے اور بڑبڑانے لگا۔

"مر گیا مرنے والا۔ جنتی تھا۔ جنت کو گیا۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ میرے والد کے انتقال کی خبر سابقہ خانساماں جی اور موجودہ اندھے بھکاری نے بیگم مسعود کے کسی ملازم سے شاید حال ہی میں سنی تھی اور جب ہی یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ میں وہاں آئی ہوئی ہوں۔ میں ان سے یہ بھی پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی کہ انہوں نے آنکھیں کب کھوئیں اور کب سے بھیک مانگ رہے ہیں۔ ان سوالوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں گم صم کھڑی ان کو دیکھتی رہی۔

"اتنی عمر میں آپ نے بہت بھاری دکھ دیکھ لئے بٹیا۔" انہوں نے اپنی بے نور آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"اور ابھی بہت دکھ باقی ہیں۔" میں نے دل میں کہا۔

"مسلمانان دوہرہ دون ۔ خبردار ہو جاؤ"، مسلم لیگ کے رضاکار ایک کار لگے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کرتے ہوئے زن سے گزر گئے۔ پھر چند سائیکل سڑک پر سے گزرے۔ انہوں نے سائیکل پر ترنگے کے بجائے نارنجی اور سفید، صرف دو رنگوں کے جھنڈے لگا رکھے تھے۔

ابھی بہت سے دکھ اٹھانے باقی ہیں۔ میں نے دل میں دہرایا۔

" باجی۔ شفیع احمد قدوائی مارے گئے" میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ برساتی میں نکل کر بیگم مسعود کی لڑکی صوفیہ روتے ہوئے چلا رہی تھی۔" ابھی ابھی مسوری سے فون آیا ہے۔" میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

کیا ہوا ؟ کیا ہو رہا ہے ؟ خانساماں جی نے چہرہ اوپر اٹھا کر سوال کیا۔

" باجی ۔" صوفیہ نے دہشت زدہ اور سراسیمہ آواز میں پھر پکارا۔

"میں ابھی آتی ہوں خانساماں جی "

" اچھا۔ میں یہیں بیٹھا ہوں" وہ لاٹھی ٹیک کر اٹھے اور کانپتے کانپتے ہاتھوں سے پھاٹک کے کھمبے کا سہارا لے کر پلیا پر بیٹھ گئے۔

میرے اندر واپس جاتے ہی ایک فوجی عزیز کی کار زناٹے سے برساتی میں آن کر رکی۔ اور فوجی عزیز نے مجھ سے کہا" میں فوراً ان کے ساتھ گھر چلوں کیونکہ شام کی گاڑی سے ہم لوگ دوہرہ دون سے روانہ ہو رہے ہیں ۔

لیکن روانگی کے انتظامات میں بہت دیر لگ گئی اور جب ہم لوگ بیلی لاج سے نکلے تو دن ڈھل چکا تھا۔ سڑک پر پہنچ کر میں نے فوجی عزیز سے کہا کہ کار روک لیں۔" کیوں" اب کسی سے

قبل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے تین شرنارتھی خاندانوں کو ٹھہرا دیا تھا۔ ان کنبوں کے بیشتر افراد مارے گئے تھے ایک بھی جوان لڑکی ان کے ساتھ نہیں تھی۔ میں لیمپوں کے نیچے سے گزرتی گھر کے عقب میں پہنچی اور جلا وطن، تباہ حال اور بد قسمت ملک کے بھیانک المیے کی تصویر پہلی مرتبہ اچانک میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ پچھلے برآمدوں میں پوٹلیاں بکھری پڑی تھیں۔ ایک عورت سر پہ پٹی باندھے کھاٹ پر لیٹی کراہ رہی تھی۔ کچھ عورتیں انگیٹھیاں سلگا کر ناشتہ تیار کر رہی تھیں اور مرد گھاس پر کھاٹ بچھائے بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ ایک بوڑھا سردار ایک برآمدے کے در میں نماز کے پرانے تخت پر بیٹھا چپ جی صاحب کا پاٹھ کر رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ان بوڑھوں میں سے ایک سے کہا کہ میں باکس روم کھولنا چاہتی ہوں۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا " مالک مکان ہو آپ۔؟"

" جی۔"

" مسلمان ۔ ؟"

" جی۔"

دفعتاً میں نے نظریں اٹھائیں اور خود کو سات آٹھ جٹادری سرداروں کے گھیرے میں پایا۔ عورتیں بھی اپنے اپنے کام چھوڑ کر میرے گرد جمع ہو گئیں۔ وہ سب بالکل چپ تھیں۔ اتنے میں سرداروں میں سے ایک کی گونجتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔" اگر ہم چاہیں تو تم یہاں سے زندہ واپس نہیں جا سکتیں۔" یہ اس قدر اچانک تھا کہ ایک لمحے کے لئے میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے میں نے چاروں طرف دیکھا۔ میں اپنے گھر کے آنگن میں کھڑی تھی۔ اور یہ جلا وطن پردیسی جن

ملنے ملانے کا وقت نہیں ہے۔ ٹرین چھوٹ جائے گی۔" انہوں نے گھبرا کر جواب دیا اور تیزی سے میونسپل روڈ کی طرف بڑھ گئے۔ ای۔ سی۔ روڈ سے گزرتے ہوئے اچانک میں نے دیکھا کہ دور نہر کی منڈیر کے نیچے ایک نیلے پتھر پر اس کشمیری نمدے کا ٹکڑا بچھائے جس پر اللہ دی کو بحال کروہ ہمارے گھر سے نکلے تھے۔ خانساماں جی ہاتھ پھیلائے۔ اللہ۔ اللہ۔ اللہ۔ کر رہے ہیں۔ ان کے سامنے تام چینی کی میلی رکابی خالی پڑی تھی۔

ہم لوگ میونسپل روڈ پر الگزنڈرا پیلس میں مقیم تھے۔ بے حد وسیع و عریض اور سخت رومانٹک الگزنڈرا پیلس کسی زمانے میں انگریزوں کا رہائشی ہوٹل تھا اور اسے ہمارے ان عزیزوں نے اپنی رہائش کے لئے خرید لیا تھا۔ اس کے جالدار دریچوں پر گلاب کی بیلیں چڑھی تھیں۔ اور کمروں میں انگریزوں کے وقت کی تصاویر اب تک آویزاں تھیں۔ جس وقت میں واپس پہنچی تو سامان باندھا جا چکا تھا اور چمکیلے چوبی فرش اور شاہ بلوط کی دیواروں والا عمیق بال روم ڈھنڈرا سا پڑا تھا۔ صرف ملک معظم شاہ برطانیہ اور لارڈ منٹو، لارڈ ارون اور دوسرے والسرائے گان ہند کی تصاویر وسیع آتش دان کے اوپر حسب معمول سکون اور تمکنت کے ساتھ مسکرا رہی تھیں۔

اس شام ہم کسی وجہ سے روانہ نہ ہو سکے۔ رات کو گھر والے کوٹھی کی اونچی اونچی سرخ چھتوں پر بندوق لئے ٹہلتے رہے۔ چاروں طرف اندھیرے باغ میں اونچے اونچے درخت سرسرایا کئے اور سامنے مسوری کی روشنیاں جھلملاتی رہیں۔ پچھلے پہر ٹوٹ کر مینہ برسا۔ صبح ہوتے آسمان صاف تھا اور فضا میں پھلوں اور پھولوں کی مہک اُمڈ رہی تھی۔

ناشتے کے بعد میں کچھ ضروری چیزیں لینے کے لئے اپنے گھر "آشیانہ" گئی جس میں چند روز

گھر آنگن ان سے چھن گئے تھے۔ جن کی بیٹیاں اور جوان بہوئیں لاپتہ تھیں۔ اس پرانے باوقار "آشیلنے" کے زخمی اور آشفتہ حال نئے مکین تھے۔ یک لخت میرے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ ہر لمحہ ساری کائنات کی تاریخ کا نچوڑ ہے۔ اور قومی اتہاس کے اس خوفناک موڑ پر پہنچ کر میں اور یہ میرے ہم وطن اس صورت میں ایک دوسرے کے سامنے موجود ہیں کہ ہمارے درمیان موت اور خون کی تاریک گھاٹیاں سنسنا رہی ہیں۔ اس وقت مجھ میں نجانے کہاں سے ہمت آ گئی۔ میں نے سر اُٹھا کر بوڑھے سرداروں کو دیکھا اور کہا: "اگر مجھے مار کر آپ کے دلوں کو شانتی مل جائے تو ضرور مار ڈالیئے۔" چند لمحوں تک مکمل سناٹا طاری رہا جس میں قریب کھڑا چمپا کا درخت سرسرایا کیا اور اوپر آسمان بے حد شفاف اور نیلا تھا۔

دفعتاً ایک بوڑھا سردار آگے بڑھا اور اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نفسیاتی لمحے میں یک بیک فضا بدل گئی۔ "آؤ۔ بیٹھو۔" اس نے نرمی سے کہا۔ ایک عورت نے فوراً پلنگ پر کھیس بچھایا۔ دوسری لسی کا گلاس لے کر گئی۔ ایک بچے نے ذرا شرماتے ہوئے نزدیک آ کر لیمن ڈراپ پیش کیے۔ کھاٹ پر بیٹھ کر ایک ہاتھ میں لیمن ڈراپ اور دوسرے میں لسی کا گلاس تھام کے میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جب میں الیگزنڈرا پلیس واپس پہنچی تو اسٹیشن جانے کے لئے موٹریں تیار کھڑی تھیں۔ فوجی عزیز کی بیوی نے مجھے فوراً آواز دی کہ ان کے ساتھ چل کر صوفیہ کو بیلی لاج سے لے آؤں۔ راستے میں فوجی عزیز نے تازہ ترین خبریں سنائیں۔ فسادات میں مارے جانے والوں کی تازہ ترین تعداد۔ نئی سرحدوں کی حد بندی، کراچی سے نواب زادہ لیاقت علی خان کا تازہ بیان۔ مگر شکر

ہے۔" فوجی عزیز نے کہا۔ کہ تم لوگ جلد از جلد خیریت کے ساتھ یہاں سے نکل جائیں گے۔"

" ایک بات بتایئے۔" میں نے دفعتاً ان سے پوچھا۔

" آنکھوں والوں کی سیاست میں اندھوں کی کوئی جگہ ہے ؟"

" کیا مطلب۔؟"

" مطلب یہ کہ فوج، تہذیب، زبان، خاندانوں اور دلوں کا بٹوارہ تو ہو گیا۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان کی گلیوں میں بھیک مانگتے اندھے، اپاہج فقیروں اور لاچاروں کی تقسیم کسی نے نہیں کی۔؟ مگر یہ کہ آج ہم سب اپنی بینائی کھو چکے ہیں۔"

تم ہمیشہ بے تکی بات کرتے ہو۔

آج ہم سب اپنی بینائی کھو چکے ہیں۔" میں نے لرز کر دہرایا اور اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا۔ لیکن یک لخت "فادر ٹائم" کا ہتم سکل لہراتی لمبی سفید داڑھی والا بوڑھا سردار میری آنکھوں کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

" مجھے ذرا آشیانہ پر اتار دیجئے گا۔ میں نے کہا۔

کیوں۔؟ فوجی عزیز نے کار روک کر پوچھا۔

" کاہے جان کے پیچھے پڑی ہو۔ نا مجھے کے سکھ حملہ کرنے والے ہیں، مارے جائیں گے ہم سب"۔ ان کی بیوی نے سراسیمہ ہو کر کہا۔

" بھائی جان۔ میں ذرا چند بے حد خونخوار سکھوں سے ملاقات کر آؤں۔ میں نے جلدی سے کار سے اتر کر آشیانہ کی طرف بھاگتے ہوئے جواب دیا اور تیزی سے باڑ پھلانگ کر اپنے باغ میں

داخل ہو گئی۔

اندر پہنچکر میں نے ان بوڑھے سردار کو ڈھونڈ نکالا جو اسی طرح پچھلے برآمدے میں نماز کے تخت پر بیٹھے چپ چاپ باغ کے درختوں کو تک رہے تھے۔ میں نے جلدی جلدی ان سے کہا ؛ " مجھے آپ سے ایک کام ہے ۔ یہ ہمارا گھر اب آپ کا ہے اس لئے آپ کی اجازت چاہیئے "

" یہ گھر ۔ نہ میرا ہے نہ تیرا ۔ بیٹی ۔ یہ تو رین بسیرا ہے ۔ انہوں نے جواب دیا ۔

" میرے ایک بزرگ ہیں ۔ وہ پہلے یہیں رہتے تھے " میں نے دور شاگرد پیشہ کی سمت اشارہ کیا " اب وہ اندھے ہو گئے ہیں اور بھیک مانگتے ہیں ۔ اگر وہ اس شاگرد پیشے کے کسی کونے کھدرے میں پڑے رہیں اور آپ کے یہاں سے انہیں دو وقت کی روٹی مل جائے ۔

بوڑھے سردار نے بڑے رومال سے چہرہ صاف کیا اور کہا " بے شک ۔ بے شک ۔ ہمارے پاس جو کچھ کھانے کو ہے حاضر ہے "

میں فوراً الیگزینڈرا پیلس واپس بھاگی ۔ فوجی عزیز اسی وقت لوٹے تھے اور مہاجروں کی دوسری کھیپ لانے پھر بیلی راج جا رہے تھے ۔ میں جلدی ہی کار میں بیٹھ گئی ۔ اب ٹرین کا وقت قریب آ چکا ہے ۔ بیلی لاج سے لوگوں کو لینے کے بعد کرن پور کے سامنے پہنچ کر میں نے فوجی عزیز سے پھر کہا کہ کار روک لیں ۔

اب کس سے ملنا ہے ؟" انہوں نے جھنجھلا کر پوچھا ۔

" ایک بڑے آدمی سے جو کل سے میرے منتظر ہیں ۔ اور مجھے ان کو ایک دوسرے بڑے آدمی کے پاس پہنچانا ہے "

"کون بڑا آدمی بھئی۔؟ سر رگھوناتھ کو تو تم خدا حافظ کہہ آئے۔ رہے نواب صاحب بہرام پور اور ہز ہائی نس۔ ڈیم۔" انہوں نے زور سے بریک لگائی۔ کیونکہ ایک گائے کار کے سامنے آگئی تھی۔ میں دروازہ کھول کر تیر کی طرح نہر کے کنارے پہنچی۔ لیکن بارش میں بھیگا نیلا پتھر خالی پڑا تھا۔ کشمیری نمدے کا ٹکڑا کیچڑ میں لت پت ایک طرف کو بہہ گیا تھا۔ اور تام چینی کی شکستہ میلی رکابی مٹی میں اوندھی پڑی تھی۔

"کیا ہوا۔؟" فوجی عزیز کار قریب لائے۔

"کچھ نہیں۔ چلئے۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا اور آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ کار فراٹے سے ریلوے اسٹیشن روانہ ہو گئی۔

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے

ٹرین مغربی جرمنی کی سرحد میں داخل ہو چکی تھی۔ حد نظر تک لالہ کے تختے لہلہا رہے تھے۔ دیہات کی شفاف سڑکوں پر سے کاریں زناٹے سے گزرتی جاتی تھیں ندیوں میں بطخیں تیر رہی تھیں۔ ٹرین کے ایک ڈبے میں پانچ مسافر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ایک بوڑھا جو کھڑکی سے سر نکالے باہر دیکھ رہا تھا۔ ایک فربہ عورت جو شاید اس کی بیٹی تھی اور اس کی طرف سے بہت فکرمند نظر آتی تھی۔ غالباً وہ بیمار تھا۔ سیٹ کے دوسرے سرے پر ایک خوش شکل اور طویل القامت شخص چالیس سال کے لگ بھگ عمر متبسم، پُرسکون چہرہ، ایک فرنچ کتاب کے مطالعے میں منہمک تھا۔ مقابل کی کرسی پر ایک نوجوان لڑکی جو وضع قطع سے امریکن معلوم ہوتی تھی، ایک باتصویر رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ اور کبھی کبھی نظریں اُٹھا کر سامنے والے پُرکشش شخص کو دیکھ لیتی تھی۔ پانچویں مسافر کا چہرہ اخبار سے چھپا ہوا تھا۔ اخبار کسی ادق اجنبی

زبان میں تھا، شائد نارویجن یا ہنگیرین، یا ہو سکتا ہے آئس لینڈک۔ اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو آئس لینڈک میں باتیں کرتے ہیں، پڑھتے لکھتے اور شعر کہتے ہیں۔ دنیا عجائب سے خالی نہیں۔

امریکن نما لڑکی نے جو خالصتاً امریکن تجسس سے یہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ کون سی زبان ہے۔ اس خوبصورت آدمی کو اخبار پڑھنے والے نوجوان سے بات کرتے سنا۔ وہ بھی کسی اجنبی زبان میں بول رہا تھا۔ لیکن وہ زبان ذرا مانوس سی معلوم ہوئی۔ لڑکی نے قیاس کیا کہ یہ شخص ایرانی یا ترک ہے، وہ اپنے شہر ٹورنٹو میں چند ایرانی طلبار سے مل چکی تھی چلو یہ تو پتہ چل گیا کہ یہ فیبولس گائے FABULOUS GUY پرشین ہے (اس نے انگریزی میں سوچا، میں آپ کو اردو میں بتا رہی ہوں کیونکہ افسانہ بزبان اردو ہے)

اچانک بوڑھے نے جو انگریز تھا۔ آہستہ سے کہا۔

' دنیا واقعی خوبصورت ہے۔

یہ ایک قطعی برطانوی انڈراسٹیٹمنٹ تھا۔ رڑکی کو معلوم تھا کہ دنیا حد سے زیادہ خوبصورت جگہ ہے۔

بوڑھے کی بیٹی کنیڈین لڑکی کو دیکھ خفیف سی اُداسی سے مسکرائی۔ باپ کی ٹانگوں پر کمبل پھیلا کر مادرانہ شفقت سے کہا۔

" ڈیڈ۔ اب آرام کرو۔"

اس نے جواب دیا " ایڈنا۔ میں یہ مناظر دیکھنا چاہتا ہوں۔

اس کی بیٹی نے رسان سے کہا" اچھا. اس کے بعد ذرا سا سو جاؤ"

اس کے بعد وہ آکر کینیڈین لڑکی کے پاس بیٹھ گئی گو انگریز تھی مگر شائد اپنا دکھ بانٹنا چاہتی تھی

میرا نام ایڈنا ہنٹ ہے۔ یہ میرے والد ہیں پروفیسر چارلس ہنٹ۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

یں تمہارا فیلڈنگ ہوں۔ ٹورنٹو۔ کنیڈا"

"کیمبرج۔ انگلینڈ۔ ڈیڈ وہاں پیٹر ہاؤس میں ریاضی پڑھاتے تھے"

کچھ بیمار ہیں۔

" سرطان۔ اور انہیں بتا دیا گیا ہے" ایڈنا نے سرگوشی میں جواب دیا۔

" اوہ۔ آئی ایم سو سوری" تمارا فیلڈنگ نے کہا۔ خاموشی چھا گئی۔ کسی اجنبی کے ذاتی الم میں دفعتاً داخل ہو جانے سے بڑی خجالت ہوتی ہے۔

" اگر تم کو یہ معلوم ہو جائے" ایڈنا ہنٹ نے آہستہ آہستہ کہا" کہ یہ دنیا بہت جلد فلاں مدت کے بعد اور ہمیشہ کے لئے چھوڑنی ہے تو جانے۔ کیسا لگتا ہوگا"

" اس معاملے میں انسان کو بہت صابر اور فلسفی ہو جانا چاہیئے۔ تمارا نے کہا اور خفت سے ہنسی۔

" حالانکہ یہ بھی بے کار ہے"

" تم ٹھیک کہتی ہو" ایڈنا ہنٹ نے جواب دیا۔

" جیسے میں اس وقت خود صابر اور فلسفی بننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ایڈنا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا گو بحیثیت ایک وضعدار انگریز خاتون وہ کسی سے ذاتی سوال کرنا نہ چاہتی تھی۔ اس بے تکلف کینیڈین لڑکی نے بات جاری رکھی۔

یں جرمنی آنا نہ چاہتی تھی ۔ اس ملک سے بہت خوفناک یادیں وابستہ ہیں ۔ میری والدہ کے دو ماموں ایک خالہ ان کے بچے ۔ سب کے سب ۔ میری ممی آج بھی کسی فیکٹری سے چمنی سے دھواں نکلتا دیکھتی ہیں تو منہ پھیر لیتی ہیں ۔

" اوہ ۔ "

" حالانکہ یہ میری پیدائش سے بہت پہلے کے واقعات ہیں ۔ "

" اوہ ۔ میں تمہارے کرسچین نام سے سمجھی تم روسی نژاد ہو ۔ حالانکہ تمہارا خاندانی نام خالص اینگلو سیکسن ہے ۔ "

" میرے نانا روسی تھے ۔ میرے والد کا اصل نام ڈیوڈ گرین برگ تھا ۔ کینیڈا جا کر تعصب سے بچنے کے لئے بدل کر فیلڈنگ کر لیا لیکن میں ۔ " اس نے ذرا جوش سے کہا ۔ میں اپنے باپ کی طرح بزدل نہیں ۔ میں اپنا پورا نام اس طرح لکھتی ہوں تمارا گرین برگ فیلڈنگ ۔ "

" واقعی ۔ ؟ " برطانوی خاتون نے کہا ۔ " کتنی دل چسپ بات ہے ۔ "

" اولاد آدم کا شجرہ بہت گنجلک ہے ۔ تمارا نے غیر ارادی طور پر ذرا اونچی آواز میں کہا ۔ کیونکہ وہ اس وجہ سے ہمیشہ متحیر رہتی تھی ۔

سامنے والے دل کش آدمی نے اس کا فقرہ سنا اور سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرایا ۔ گویا کہتا ہو " میں تمہاری بات سمجھتا ہوں ۔ " لڑکی دل ہی دل میں اس کی مشکور ہوئی ۔ اور اسے دیکھ کر خود بھی مسکرائی اب غالباً میں اس اجنبی پر عاشق ہوتی جا رہی ہوں ۔

برطانوی خاتون نے بھی غالباً یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دل چسپی سے دیکھ

رہے ہیں۔ ایک جگہ پر دو انسان ایک دوسرے کی طرف کھنچیں تو سمجھ لیجئے کہ اس انڈر کرنٹ کو حاضرین فوراً محسوس کر لیں گے۔ کیونکہ اولادِ آدم کی باہم کشش کا عجیب گھپلا ہے۔

بوڑھا پروفیسر آنکھیں کھول کر پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

میرے نانا۔ جب کریمیا سے بھاگے انقلاب کے وقت تو اپنے ساتھ صرف قرآن لے کر بھاگے تھے" تمارا نے آہستہ سے کہا۔

کوران۔؟ ایڈنا نے تعجب سے دہرایا۔

ہاں۔ وہ موزلم تھے اور میری نانی ممی کو بتاتی تھیں وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ قرآن میں لکھا ہے دنیا بہت خوبصورت ہے۔ اس میں خوشی سے رہو اور دوسروں کو بھی خوش رہنے دو۔ اور شاید موزلم پروفٹ نے کہا تھا کہ اس سے بہتر دنیا نہیں ہو سکتی تھی" سگریٹ سلگانے کے لئے تمارا نے حسبِ معمول لائٹر کی تلاش میں بیگ کھنگالنا شروع کیا۔ ایرانی نما شخص نے فوراً آگے جھک کر اپنا لائٹر جلایا۔ پھر اجازت چاہ کر تمارا کے پاس بیٹھ گیا۔

ایڈنا ہنٹ دوسری طرف سرک گئی۔ ایرانی نما شخص کھڑکی کے باہر گزرتے ہوئے سہانے مناظر دیکھنے میں محو ہو گیا۔ تمارا نے اس سے آہستہ سے کہا" یہ بزرگ سرطان میں مبتلا ہیں۔ جن لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ چند روز بعد دنیا سے جانے والے ہیں انہیں جانے کیسا لگتا ہو گا۔ یہ خیال کہ ہم بہت جلد معدوم ہو جائیں گے۔ یہ دنیا پھر کبھی نظر نہ آئے گی۔

ایرانی نما نوجوان دردمندی سے مسکرایا۔" جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ وہ عنقریب موت کے منہ میں جانے والا ہے۔ وہ سخت دل ہو جاتا ہے۔"

ہمسفر نے اپنا نام بتایا۔ دکتور شریفیان۔ تبریز یونیورسٹی شعبہ تاریخ۔ کارڈ دیا۔ اس پر نام کے بہت سے نیلے حروف چھپے تھے۔ لڑکی نے فطری تجسس سے دریافت کیا: ”این۔ آئی۔ کیو ریلیفی۔؟“

”نسرت الدین امام قلی۔“

لڑکی نے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ اس نصرت الدین امام قلی سے اس کی پہلی اور آخری ملاقات ہرگز نہیں ہے۔

ایک قصبے کے اسٹیشن پر ٹرین رکی۔ اخبار پڑھنے والا لڑکا اسی جگہ سرعت سے اتر گیا۔ دکتور شریفیان بھی لپک کر باہر آگئے۔ باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔ درخت اور پھول اور گھاس پانی میں جگمگا رہے تھے۔ آکا دکا مسافر برساتیاں اوڑھے پلیٹ فارم پر چپ چاپ کھڑے تھے۔ چند لمحوں بعد ایرانی پروفیسر لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمپارٹمنٹ میں واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں لالہ کے دو گلدستے تھے جو اس نے بڑے اخلاق سے جھک کر برطانوی اور کنیڈین خواتین کو پیش کئے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ بوڑھا سو چکا تھا۔ دوسرے کونے میں اس کی فربہ بیٹی اپنی باہنوں پر سر رکھ کر اونگھ رہی تھی۔ دفعتاً ایرانی دکتور نے کنیڈین لڑکی سے کہا: ”تمارا خانم۔ کہاں تک میرے ساتھ رہو گی۔“

وہ اس سوال کا مطلب سمجھی اور اسے آج تک کسی نے تمارا خانم کہہ کر مخاطب نہ کیا تھا۔ دراصل وہ اپنے گھر اور کالج میں ٹم کہلاتی کہاں نامعقول ٹم۔! اور کہاں تمارا خانم۔ جیسے سرود بج رہا ہو یا عمر خیام کا مصرع۔ تمارا خانم کی ایران سے واقفیت محض ایڈورڈ فٹز جیرلڈ تک محدود تھی۔ اس نے اسی کیفیت میں کہا: ”جہاں تک ممکن ہو۔“

بہرحال وہ، دونوں ایک ہی جگہ جا رہے تھے۔ تمارا نے ایرانی پروفیسر کے سوٹ کیس پر چپکا ہوا لیبل پڑھ لیا تھا۔

"تم وہاں پڑھنے جا رہی ہو یا سیر کرنے؟"

"پڑھنے۔ بائیو کیمسٹری۔ مجھے ایک اسکالرشپ ملا ہے۔ تم ظاہر ہے پڑھانے جا رہے ہو گے۔"

"صرف چند روز کے لئے۔ میری دانش گاہ نے ایک ضروری کام سے بھیجا ہے۔"

ٹرین قرون وسطیٰ کے ایک خوابیدہ یونیورسٹی ٹاؤن میں داخل ہوئی۔

دوسرے روز وہ وعدے کے مطابق ایک کیفے ٹیریا میں ملے کاؤنٹر سے کھانا لینے کے بعد ایک دریچے والی میز پر جا بیٹھے۔ دریچے کے عین نیچے خوش منظر ندی بہہ رہی تھی۔ دوسرے کنارے پر ایک کائی آلود گوتھک گرجا کھڑا تھا۔ سیاہ گاؤن پہنے انڈر گریجویٹ ندی کے پل پر سے گزر رہے تھے۔

"بڑا خوبصورت شہر ہے" تمارا نے بے ساختہ کہا۔ حالانکہ وہ جرمنی کی کسی چیز کی تعریف کرنا نہ چاہتی تھی۔

دکتور نصرت الدین بے حد پر مذاق اور خوشدل شخص تھا۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسے ہنساتا رہا۔ تمارا نے اسے یہ بتانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ جرمنی سے کیوں متنفر تھی۔

اچانک نصرت الدین نے خالص طہرانی لہجے میں اس سے کہا "خانم جون"

"ہوں؟ جون کا مطلب؟"

"زندگی۔!"

وُنڈرزل، یعنی میں تمہاری زندگی ہوں!"

اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا" ہاہا۔ میری زندگی! سنو خانم جون۔ ایک دل چسپ بات بتاؤں۔ تم مجھے بالکل میری دادی جیسی لگتی ہو۔"

بہت خوب۔ آپ سے زیادہ بااخلاق شخص دنیا میں نہ ہوگا۔ ایک چوبیس سالہ لڑکی کو آپ اپنی دادی بنائے دے رہے ہیں۔"

"واللہ۔ کسی روز تمہیں ان کی تصویر دکھلاؤں گا۔"

دوسری شام وہ اس کے ہوٹل کے کمرے میں آیا۔ تمارا اب تک اپنے سوٹ کیس بند کرکے سامان ترتیب سے نہیں جما سکی تھی۔ سارے کمرے میں چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔

بھئی بہت پھوہڑ لڑکی ہو۔ کوئی سمجھدار آدمی تم سے شادی نہ کرے گا۔" اس نے آتش دان کے سامنے چمڑے کی آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

تمارا نے جلدی جلدی کچھ سامان اٹھا کر ایک طرف رکھا۔

"لوگ باگ مجھ سے ابھی سے جلنے لگے ہیں کہ میں نے آتے ہی کیمپس کی سب سے خوبصورت لڑکی چھانٹ لی۔"

"چھانٹ لی۔ اعرب شیوخ کی طرح آپ بھی حرم رکھتے ہیں!" تمارا نے مصنوعی غصے سے کہا۔

وہ زور سے ہنسا اور کرسی کی پشت پر سر لٹکا دیا۔ دریچے کے باہر صنوبر کے پتے سرسرائے۔

"وہ بھی عجیب عیاش بزدل ظالم قوم ہے۔" تمارا نے مزید اظہار کیا اور ایک الماری کا پٹ زور سے بند کر دیا۔ الماری کے قدآدم آئینے میں اس کا دلنواز پروفائل نظر آیا اور اس پر مزید عاشق

ہوئی۔

"تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ خانم جون۔ ہم ایرانیوں کی بھی عربوں سے کبھی نہیں پٹی۔ ہم تو انہیں کا کروچ کھانے والا کہتے ہیں"۔ نصرت نے مسکرا کر پائپ جلایا۔

"کاکروچ کھاتے ہیں۔؟ تمارا نے حیرت سے پوچھا اور منہ بنایا۔" وحشی۔ بدو۔ مشرقی، معاف کرنا میرا مطلب ہے۔ تم تو ان سے بہت مختلف ہو۔ ایرانی تو مڈل ایسٹ کے فرنچ مین کہلاتے ہیں۔

"درست۔ متشکرم۔ متشکرم!"

"ترجمہ کرو۔"

"جی۔ !تھینکس۔" اس نے ناک میں بولنے والے امریکن لہجے میں کہا۔

وہ خوب کھلکھلا کر ہنسی۔ "تم بہت اچھے اداکار ہو۔ کم سے کم ٹی وی اسٹار تو بن سکتے ہو۔"

واقعی؟۔ بہت جلد تم مجھے ٹی۔ وی اسکرین پر دیکھ لو گی۔"

"کیا تم نے کبھی ایکٹنگ کی ہے۔؟"

"بہت۔ کالج میں ہمیشہ رومیو یہ خاکسار ہی بنا کرتا تھا اور فرہاد۔"

"فرہاد کون؟"

تھے ایک صاحب۔ آغا فرہاد بیگ۔" اس نے نظامی کے چند اشعار پڑھے۔ ان کا ترجمہ کیا۔ پھر پروفیسروں والے انداز میں جیسے کلاس کو پڑھاتا ہو۔ اس راستے کا نقشہ سمجھایا جدھر سے آرمینیا کی شہزادی شیریں اس کے اپنے وطن آذربائیجان سے گزرتی ہوئی خسرو کے دارالسلطنت پہنچی تھی۔ بعدازاں کوہ بہستون کا جغرافیہ اس کنیڈین دانش جو کو ذہن نشین کرایا۔

ہفتے کی شام کو وہ پہلی بار وکتور شریفیان کی قیام گاہ پر اس کے ہمراہ گئی۔ کیمپس سے خاصی دور صنوبروں کے جھرمٹ میں چھپی ایک پرانی عمارت کی دوسری منزل پر اس کا دو کمروں کا ایک اپارٹمنٹ تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر نصرت الدین نے لیمپ جلایا۔ تمارا نے کوٹ اتار کر کرسی پر رکھتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ فارسی کتابیں اور رسالے سارے بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔

تمارا کو معلوم تھا اب وہ ہزاروں بار دہرایا ہوا نقشہ دہرایا جائے گا۔ وہ ریڈیو گرام پر ریکارڈ لگائے گا۔ پھر اس سے پوچھے گا۔ اسے کون سی شراب پسند ہے۔ عین اس وقت سارے مغرب کے اَن گنت کمروں میں یہی ڈرامہ کھیلا جا رہا ہوگا اور وہ اس ڈرامے میں اس آدمی کے ساتھ حصّہ لیتے ہوئے ناخوش نہ تھی۔

نصرت نے قیمتی فرانسیسی شراب اور دو گلاس سائیڈ بورڈ سے نکالے اور صوفے کی طرف آیا۔ پھر اس نے جھک کر کہا ”تمارا خانم۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم کو اپنی دادی سے ملوا دوں۔“

وہ سُرخ ہو گئی ”معلوم ہے ہمارے یہاں مغرب میں اس جملے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟“

”معلوم ہے۔“ اس نے ذرا بے پروائی سے کہا۔ لیکن اس کے لہجے کی اس خفیف سی بے پروائی کو تمارا نے شدت سے محسوس کیا۔ اب نصرت الدین نے الماری میں سے ایک چھوٹا سا البم نکالا اور ایک ورق اُلٹ کر اسے پیش کیا۔

ایک بے حد حسین لڑکی پچھلی صدی کے خادرمیانہ کی پوشاک میں ملبوس ایک فرنچ وضع کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ پس منظر میں سنگترے کے درخت تھے۔

دادی اماں۔ اور یہ ہمارا سنگتروں کا باغ تھا۔"

تمارا نے دیکھا دادی میں اس کی بہت ہلکی سی مشابہت ضرور موجود تھی۔ اس نے دوسرا صفحہ پلٹنا چاہا۔ نصرت الدین نے فوراً بڑی ملائمت سے البم اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ تمارا خانم وقت ضائع نہ کرو۔ وقت بہت کم ہے۔"

تمارا نے سینڈل اتار کر پاؤں صوفے پر رکھ لئے وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔" اتنے نازک چھوٹے چھوٹے پیر۔ تم ضرور کسی شاہی خاندان سے ہو۔"

"ہوں تو سہی شاید۔"

"کون سا! ہز میجسٹی اعلیٰ حضرت تمارے والا یا چچا یا دادا اس وقت سوئٹزرلینڈ کے کون سے قصبے میں پناہ گزین ہیں؟"

میرے والد ٹورنٹو میں ایک گارمنٹ فیکٹری کے مالک ہیں۔" تمارا نے نہیں دیکھا کہ ایک ہلکا سا سایہ دکتور شریفیان کے چہرے پر سے گزر گیا۔" لیکن میرے نانا غالباً خواتین کریمیا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔"

اوہو۔ خواتین کریمیا! حاجی سلیم گرائی۔ قرادولت گرائی۔ جانی بیگ گرائی۔ محمود گرائی۔ کون سے گرائی؟"

"نصرت۔ مجھے معلوم ہے تم تاریخ کے استاد ہو۔ رعب مت جھاڑو۔ مجھے پتہ نہیں کون سے گرائی۔ میں نے تو یہ نام بھی اس وقت تم سے سنے ہیں۔"

اور موصوف تمارے نانا بالشویک انقلاب سے بھاگ کر پیرس آئے۔"

"ہاں ۔ وہی پرانی کہانی : پیرس آئے اور ایک ریستوران میں نوکر ہو گئے اور ریستوران کے مالک کی خوبصورت لڑکی روزلین سے شادی کر لی ۔ اور روزلین کے آبا بہت خفا ہوئے ۔ کیونکہ ان کی دوسری لڑکیوں نے یہاں جرمنی میں اپنے ہم مذہبوں سے بیاہ کئے تھے ۔" وہ دفعتاً چپ ہو گئی ۔ اب اس کے چہرے پر سے ایک ہلکا سا سایہ گزرا جسے نصرت الدین امام علی نے دیکھا ۔

چند لمحوں بعد تمارا نے پھر کہنا شروع کیا ۔ "روزلین کے آبا واقعی بہت خفا تھے ۔ جب روزلین ان سے فخریہ کہتیں کہ انہوں نے ایک روسی شہزادے سے شادی کی ہے تو وہ گرج کر جواب دیتے آجکل ہر چیز تفنات کو چوان سائیس خاکروب جو روس سے بھاگ کر یہاں آرہا ہے ۔ اپنے آپ کو ڈیوک اور کاؤنٹ سے کم نہیں بتاتا تمہارا تاتاری خاوند بھی کریمیا کے کسی خاندان کا چوبدار رہا ہو گا ۔ تانا بیچارے کا تین سال بعد ہی انتقال ہو گیا ۔ دراصل شاید جلا وطنی کا الم انہیں کھا گیا ۔" اب شریفیان کے چہرے پر سے ایک اور سایہ گزرا جسے حسب معمول تمارا نے نہیں دیکھا ۔ "میری ممی ان کی اکلوتی اولاد تھیں ۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ممی نے ایک پولش ریفیوجی سے شادی کر لی ۔ وہ دونوں آزاد فرانسیسی فوج میں اکٹھے لڑے تھے ۔ جنگ کے بعد وہ فرانس سے ہجرت کر کے امریکہ آگئے ۔ جب میں پیدا ہوئی تو ممی نے میرا نام اپنی ایک نادیدہ مرحومہ پھوپھی کے نام پر تمارا رکھا ۔ وہ پھوپھی روسی خانہ جنگی میں ماری گئی تھیں ۔ ہمارے خاندان میں نصرت الدین ایسا لگتا ہے کہ ہر نسل نے دونوں طرف ۔ سوائے خوفناک قسم کی اموات کے کچھ نہیں دیکھا ۔"

"ہاں بعض خاندان اور بعض نسلیں ایسی بھی ہوتی ہیں ۔" نصرت الدین نے آہستہ سے کہا ۔ پھر پوچھا ۔ "فی الحال تمہاری قومیت کیا ہے ؟"

"کنیڈین۔"

ایرانی پروفیسر نے شراب گلاس میں انڈیلی اور مسکرا کر کہا "تمہارے نانا اور میری دادی کے نام" انہوں نے گلاس ٹکرائے۔

دوسرے ہفتے کا ذکر ہے، سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ایک ریستوران کی سمت جاتے ہوئے بازار میں سے گزرے اچانک وہ کھلونوں کی ایک دوکان کے سامنے ٹھٹھک گیا اور کھڑکیوں میں سجی گڑیوں کو بڑے پیار سے دیکھنے لگا۔

"تمہارے بہت سارے بھانجے بھتیجے ہیں نصرت الدین" تمارا نے دریافت کیا۔

وہ اس کی طرف مڑا اور سادگی سے کہا "میرے پانچ عدد بچے اور ایک عدد ان کی ماں محبوب بیوی ہے۔ میری سب سے بڑی لڑکی اٹھارہ سال کی ہے۔ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ اور اس کا منگیتر۔ میرے بڑے بھائی کا لڑکا ہے۔ وہ دراصل ہماری ائرفورس میں ٹسٹ پائلٹ ہے۔ اس لئے کچھ پتہ نہیں۔ بہت خطرناک زندگی ہے اس بے چارے کی" وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

اس وقت تمارا کو معلوم ہوا جب کسی پر فالج گرتا ہو تو کیسا لگتا ہو گا۔ اس نے آہستہ سے خوددار آواز میں جس سے ظاہر نہ ہو کہ شاکی ہے، کہا۔ "تم نے کبھی بتایا نہیں"

"تم نے کبھی پوچھا نہیں" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اچانک تمارا نے اسے پہلی بار دیکھا۔ وہ ایک ننگی انسان تھا کوہ بلیتون کے پتھروں سے ترشا ہوا مجسمہ۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ تمارا اس سے اسی طرح ملا کی۔ وہ اسے مغرب کی PERMISSIVE سوسائٹی کی ایک آوارہ گرد عام لڑکی سمجھتا ہے تو سمجھا کرے۔ وہ تو اس پر سچے دل سے عاشق تھی،

اس پر جان دیتی تھی۔

ایک رات ندی کے کنارے بنچ پر بیٹھے ہوئے نصرت الدین نے تمارا سے کہا۔ "ملہ خانہ خاتون۔"

"کون۔؟"

علاؤالدین کیقباد دوم کی ملکہ۔

کبھی وہ اسے ترکان خاتون کہہ کر پکارتا۔ ملک شاہ سلجوقی کی بیگم کبھی اسے شہزادی ساقی بیگ کہتا۔ "کیونکہ تمہارے اندر کم از کم پندرہ فی صد تاتاری خون تو ہے ہی۔ اور سنو۔ فرض کرو۔" ندی کے کنارے اس رات اس نے کہا۔ "اگر تمہارے نانا کریمیا ہی رہ گئے ہوتے۔ وہیں کسی خانزادی سے شادی کرلی ہوتی اور تمہاری اماں فرض کرو ہمارے کسی ادغلو پاشا سے بیاہ کر تبریز آجاتیں تو تم میری گل چہرہ خانم ہوسکتی تھیں۔"

دفعتہً وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نسل۔ خون۔ کس کا کیا قصور ہے! وہ بہت بے رحم تھے۔

نصرت الدین اس کے رونے سے مطلق نہ گھبرایا۔ نرمی سے کہا۔ "چلو۔ بی بی جون۔ گھر چلیں۔"

"گھر۔؟" اس نے سر اٹھا کر کہا۔ "میرا گھر کہاں ہے۔؟"

تمہارا گھر ٹورنٹو میں ہے۔ "تم نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ میرا گھر کہاں ہے۔" نصرت نے ذرا تلخی سے کہا۔ وہ روتی رہی۔ لیکن اچانک دل میں امید کی مدھم سی شمع روشن ہوئی۔ یہ ضرور اپنی بیوی سے ناخوش ہے۔ اس کی ازدواجی زندگی پُرسکون نہیں ہے۔ اسی وجہ سے کہہ رہا ہے۔ "میرا گھر کہاں ہے۔؟"

ان تمام مغربی لڑکیوں کی طرح جو مشرقی نوجوانوں سے معاشقے کے دوران ان کی زبان سیکھنے

کی کوشش کرتی ہیں۔ تمارا بڑے اشتیاق سے فارسی کے چند فقرے یاد کرنے میں مصروف تھی۔ ایک روز کیفے ٹیریا میں اس نے کہا "آغا۔ اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ جب ہم بوڑھے ہو جائیں تب ملیں "

ہاں "۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں "

" آج سے بیس سال بعد جب تم مورخوں کی کسی کانفرنس کی صدارت کے لئے مونٹریال آڈیا یو۔ این۔ او میں ایرانی سفیر ہو کر نیویارک پہنچو۔

" اور تم کسی امریکن کروڑ پتی کی فربہ بیوہ ہو "

" ہاں ۔ اور ٹفنی میں ہماری اچانک مڈبھیڑ ہو جائے۔ جہاں تم اپنی نواسی کی منگنی کی انگوٹھی خریدنے آئے ہو۔ اور تم سوچ میں ہو کہ اس بوڑھی موٹی عورت کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔ فارسی میں بوڑھی عورت کو کیا کہتے ہیں ؟"

" پیرزن "

" اور عربی میں ؟"

" مجھے عربی نہیں آتی۔ ترکی اور فرنچ میں البتہ بتا سکتا ہوں "

" سنو۔ نصرت الدین۔ ایک بات سنو۔ آج صبح میں نے ایک عجیب خوفناک وعدہ اپنے آپ سے کیا ہے "

" کیا ۔؟"

" جب میں اس امریکن کروڑ پتی سے شادی کروں گی "

"جو بوجہ السر تمہیں جلد بیوہ کر جائیگا۔"

"ہاں۔ لیکن اس سے قبل ایک بار۔ صرف ایک بار۔ تم جہاں کہیں بھی ہو گے۔ تبریز۔ اصفہان شیراز۔ میں وہاں پہنچ کر اس اپنے نامعقول شوہر کے ساتھ ضرور بے وفائی کروں گی۔ ضرور بالضرور۔"

نصرت نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "بعض مرتبہ تم مجھے اپنی دادی کی تصویر معلوم ہوتی ہو۔ بعض دفعہ میری لڑکی کی۔ وہ بھی تمہاری طرح۔ تمہاری طرح اپنے ابنِ عم کو اسی شدت سے چاہتی ہے۔" وہ پھر ملول نظر آیا۔

"آغا۔ تم مجھے بھی اپنی بنتِ عم سمجھو۔"

"تم میری بنتِ عم ہو تو سہی۔"

"کیونکہ ہم سب اولادِ آدم ہیں۔ ہے نا۔؟"

"اولادِ آدم۔ اولادِ ابراہیمؑ۔ آلِ یافث۔ آلِ اسحٰق۔ آلِ اسمٰعیل۔ میں انسان کے شجرہ نسب کے اس گھپلے پر مزید روشنی ڈال سکتا تھا۔ تمارا خانم لیکن اب کھانا شروع کر دو۔"

وہ ریستوران کی دیوار پر لگے ہوئے آئینے میں اس کا پروفائل دیکھنے لگی اور بولی۔

"میں نے آج تک ایسی خوبصورت ناک نہیں دیکھی۔"

"آغا۔ تم میں نرگسیت بھی ہے۔"

"ہے۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔

اس وقت اچانک تمارا کو ایک قدیم فرانسیسی دعا یاد آئی جو برٹینی کے ماہی گیر سمندر میں اپنی کشتی لے جانے سے پہلے پڑھتے تھے۔ اے رب عظیم۔ میری حفاظت کرنا۔

میری ناؤ اتنی چھوٹی سی ہے۔

اور تیرا سمندر اتنا بڑا ہے۔

اس نے دل میں دہرایا۔

اے رب عظیم۔ اس کی حفاظت کرنا

اس کی ناؤ اتنی چھوٹی سی ہے۔

اور تیرا سمندر۔

"آغا۔ ایک بات بتاؤ۔"

"ہوں۔ ہوں۔"

"تم نے آج کا اخبار پڑھا؟ تمہارے ملک کے بہت سے دانش جو اور دانشور شہنشاہ کے خلاف ہیں۔ انہوں نے برلن میں کل بڑا جلوس نکالا۔"

"پڑھا۔"

"تم تو جلاوطن ایرانی نہیں ہو؟"

"نہیں۔ میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تمارا خانم لڑکے پڑھاتا ہوں۔"

"اچھا شکر ہے۔ دیکھو۔ کسی خطرے میں نہ پڑنا۔ ہر طرف آج کل دنیا میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اپنا خیال رکھو۔"

"اچھا۔"

اس رات وہ حسب معمول ندی کے کنارے بیٹھے تھے۔ تمارا نے کہا، "جب ہم اپنے اپنے

دیس واپس جائیں گے مجھے کتنی باتیں یاد آئیں گی۔ کتنی ہزاروں باتیں۔ تم کو خیر کبھی میرا خیال بھی نہ آئے گا۔ تم مشرقی لوگوں کی عادت ہے یورپ امریکہ آکر لڑکیوں کے ساتھ تفریح کی اور واپس چلے گئے۔ بتاؤ کبھی میرا خیال آئے گا۔؟"

وہ مسکرا کر چپ چاپ پائپ پیتا رہا۔

"تم نصرت الدین امام قلی میرا دل رکھنے کے لئے اتنا بھی نہیں کہہ سکتے کہ کم از کم سال کے سال ایک عدد نیو ایئرز کارڈ ہی بھیج دیا کرو گے۔ اب تک میرا پتہ بھی نوٹ بک میں نہیں لکھا۔" اس نے نصرت کے کوٹ کی جیب سے نوٹ بک ڈھونڈ کر نکالی + کا صفحہ پلٹ کر اپنا نام اور پتہ لکھا اور بولی "وعدہ کرو یہاں سے جاکر مجھے خط لکھو گے۔"

"میں غلط وعدے کبھی نہیں کرتا۔"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور ذرا خفگی سے آگے آگے چلنے لگی۔ نصرت نے چپکے سے جیب میں سے نوٹ بک نکالی۔ وہ صفحہ علیحدہ کیا جس پر تمارا نے اپنا پتہ لکھا تھا۔ باریک باریک پُرزے کرکے ان کی گولی بنائی اور ندی میں پھینک دی۔

صبح سویرے چھ بجے تمارا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے تکیے سے سر ذرا سا اُٹھا کر دریچے کے باہر دیکھا۔ صبح کی روشنی نقرئی پانی کی مانند باغ کے صنوبروں پر پھیل رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں بند کیں اور پھر سو گئی۔

سوا آٹھ بجے کے قریب جب وہ بستر سے اٹھی نصرت میز پر ناشتہ چننے میں مصروف ہو چکا تھا۔

زرد پھولوں کی وسعت میں لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔

وہ دس منٹ تک سڑک کے کنارے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے رہے۔ اتنے میں ایک بس نظر آئی۔ نصرت نے آنکھیں چندھیا کر اس کا نمبر پڑھا اور تمارا سے بولا "یہ تمہارے ہوسٹل کی طرف سے نہیں جاتی۔ تم دوسری میں چلی جانا میں اسے پکڑتا ہوں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر بس روکی۔ تمارا کی طرف پلٹ کر کہا "خداحافظ" اور لپک کر بس میں سوار ہو گیا۔

شام کو کلاس سے واپس آ کر تمارا نے حسبِ معمول اسے فون کیا۔ گھنٹی بجی وہ شاید اب تک واپس نہ آیا۔

دوسری صبح اتوار تھا۔ اس وجہ سے وہ کافی دیر میں سو کر اٹھی۔ اس کی جرمن روم میٹ باہر جا چکی تھی۔ اس نے اٹھ کر حسبِ معمول دروازے کے نیچے پڑے ہوئے سنڈے ایڈیشن اٹھائے۔ سب سے اوپر والے اخبار کی شہ سرخی میں وہ خوفناک خبر چھپی تھی۔ اس کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی وہ ڈاکٹر نصرت الدین امام قلی شریفیاں پروفیسر تاریخ دانش گاہ تبریز نہیں تھا۔ وہ ایرانی بھی نہیں تھا۔ لیکن اخبار میں اس کا جو نام چھپا تھا وہ بھی غالباً اس کا اصل نام نہ تھا۔ اس کے ساتھ دوسری تصویر اس دبلے پتلے نوجوان کی تھی جو ٹرین میں سارا وقت اخبار پڑھتا رہا تھا۔ اور خاموشی سے ایک قصبے کے اسٹیشن پر اتر گیا تھا۔

نزدیک کے ایک شہر کے ائرپورٹ میں طیارے پر دستی بموں اور مشین گنوں سے حملہ کرتے ہوئے وہ تین مارے گئے تھے۔ نصرت الدین نے حملہ کرنے کے بعد سب سے پہلے دستی بم سے خود کو ہلاک کیا تھا۔ ہنسی خوشی اپنی مرضی سے ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گیا تھا۔

وہ دن بھر نیم غشی کے عالم میں پلنگ پر پڑی رہی۔ متواتر اور مسلسل اس کے دماغ میں طرح طرح کی تصویریں گھومتی رہیں جیسے انسان کو سرسام یا ہائی بلڈ پریشر کے حملے کے دوران انوکھے نظارے دکھلائی پڑتے ہیں۔ رنگ برنگے موتیوں کی جھالریں۔ سمندر۔ بے تکی شکلیں۔ آگ اور آوازیں شاید وہ CLAREAUDIENCE کا شکار بھی ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس کے کان میں صاف آوازیں اس طرح آیا کیں جیسے کوئی برابر بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ اور ٹرین کی گڑگڑاہٹ میں سنے تمہاری بات سنی تھی۔ جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ عنقریب موت کے منہ میں جانے والا ہے وہ سخت دل ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارا سنگتروں کا باغ تھا۔ تم نے کبھی مجھ سے نہ پوچھا میرا گھر کہاں ہے۔ ونڈرفل۔

میں تمہاری زندگی ہوں۔ !۔ ہاہا۔ میری زندگی! جان من۔ چلو وقت نہیں ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ قرلون۔ چلو وقت ضائع نہ کرو۔ میری لڑکی کا نیگٹر۔ بہت خطرناک زندگی ہے۔ اس بیچارے کی۔ مجھے عربی نہیں آتی۔ ہلو ترکان خاتون۔ میں غلط وعدے کبھی نہیں کرتا۔ ایسے وعدے کبھی نہیں کرتا جو نبھا نہ سکوں تم میری بنت عم ہو تو سہی۔ آل اسحٰق۔ آل اسمٰعیل۔ میں نبی آدم کے شجرے کے اس گچھلے پر مزید روشنی ڈال سکتا ہوں لیکن تمارا خانم کھانا شروع کرو۔ دیکھو نصرت خطرے میں نہ پڑنا ہر طرف دنیا میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اپنا خیال رکھو۔ اچھا رکھوں گا۔ شہزادی ساقی بیگ۔

اندھیرا پڑے پالا اس کی روم میٹ کمرے میں آئی۔ روشنی جلا کر تمارا کی طرف دیکھے بغیر بے دھیانی سے میکانیکی انداز میں ہاتھ بڑھا کر ٹیلی ویژن کا سوئچ آن کیا اور گنگناتی ہوئی بالکنی میں چلی گئی۔

تمارا نے کروٹ بدلی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے برفیلی نیلی اسکرین دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد نیوز ریل شروع ہوئی۔ اچانک اس کا کلوز اپ سامنے آیا۔ آدھا چہرہ۔ آدھا دستی

بم سے اُڑ چکا تھا۔ صرف پروفائل باقی تھا۔ دماغ بھی اڑ چکا تھا۔ ائرپورٹ کے چمکیلے شفاف فرش پر اس کا بھیجہ بکھرا پڑا ہے۔ اور انتڑیاں۔ سیاہ جما ہوا خون۔ کٹا ہوا ہاتھ۔ کارتوس کی پیٹی۔ گوشت اور ہڈیوں کا مختصر سا ملغوبہ۔ تم بہت اچھے اداکار ہو۔ کم از کم ٹی وی اسٹار تو بن سکتے ہو۔ واقعی؟ جلد تم مجھے ٹی وی اسکرین پر دیکھ لو گی۔

کیمرہ پیچھے ہٹا۔ لالہ کا ایک گلدستہ جو بھگدڑ میں کسی مسافر کے ہاتھ سے چھٹ کر گر گیا تھا۔ برابر میں "نصرت الدین" کا کٹا ہوا ہاتھ لالہ کے پھول اس کے خون میں لت پت۔ پھر اس کا آدھا چہرہ پھر گوشت کا ملغوبہ۔ اس ملغوبے کو اتنے قریب دیکھ کر تمارا کو ابکائی سی آئی۔ وہ چکرا کر اٹھی اور غسلخانے کی طرف بھاگنا چاہا۔ اس کی ہیبت زدہ چیخ سن کر پالا اس کی روم میٹ بالکنی سے لپکی ہوئی آئی۔

تمارا نے دیکھا پالا کا چہرہ نیلا اور سفید تھا۔ پالا نے فوراً ٹیلی ویژن بند کیا اور اسے فرش پر سے اُٹھانے کے لئے جھکی۔

پالا کے سر پر سفید اسکارف بندھا ہوا تھا۔ جیسے نرس آپریشن ٹیبل پر سرطان کے مریض کو لٹاتی ہو۔ یا اسے ایک ٹرالی پر بٹھا کر گیس چیمبر کے اندر لے جایا جا رہا تھا۔ اور برابر کی بھٹی میں انسان زندہ جلائے جا رہے تھے ان کا دھواں چمنیوں میں سے نکل کر آسمان کی نیلاہٹ میں گھلتا جا رہا تھا۔

اب وہ ایک نیلے ہال میں تھی۔ دیواریں فرش چھت برف کی طرح نیلی اور سرد کمرے کے اندر کمرے۔ گیلریاں سب نیلے ایک کمرے میں سفید آتش دان کے پاس ایک نیلے چہرے والی عورت کھڑی تھی شکل سے سنٹرل یوروپین معلوم ہوتی تھی۔ پورا سراپا ایسا نیلا جیسے رنگین تصویر کا نیلا پردہ

جو ابھی پریس سے تیار ہو کر نہ نکلا ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ عجیب۔

ایک اور ہال۔ اس کے وسط میں قالین بانی کا کرگھا کرگھے پر آدھا بنا ہوا قالین۔ اس پر "شجر حیات" کا ادھورا نمونہ۔

"یہ شجر حیات کیا چیز ہے نصرت الدین؟"

"مڈل ایسٹ کے قالینوں کا موتیف خانم جون۔"

کرگھے کی دوسری طرف سر پر رومال باندھے دو مڈل ایسٹرن عورتیں۔ پھر بہت سے پردے۔ جیسے محلات میں ہوتے ہیں۔ اطلسی ابشار۔ پردوں سے نکل کر اس نے بگٹٹ بھاگنا شروع کیا۔ مگر گیلری طویل ہوتی چلی گئی۔ وہ نیچے اتری جیسے بنک کے تہہ خانے ہوتے ہیں۔ چمکیلی سنگلاخ دیواریں چمکیلا فرش یا جیل خانے کے کوریڈور سناٹا۔ اب وہ ایک بہت وسیع سرنگ میں چل رہی تھی۔ اچانک اسے چند کیچڑ کے آدمی نظر آئے۔ وہ اس سرنگ یا انڈر گراؤنڈ ریلوے کے سنسان کوریڈور میں ایک مین ہول کے اندر اور اس کے گرد پھاوڑے لئے کھڑے تھے۔ کیچڑ کے چہرے۔ کیچڑ کی وردیاں اسے دیکھ کر استہزا سے ہنسے وہ باہر نکلی عین سامنے چوڑا دروازہ تھا۔ دروازے کے باہر شہر کا بازار بارش ہو رہی تھی۔ ٹرامیں ٹن ٹن کرتی گزر رہی تھیں۔ دروازے کے برابر ایک پھول والی برساتی اوڑھے بیٹھی پھول بیچ رہی تھی۔ اس نے قریب جا کر اس عورت کو چھوا۔ وہ عورت مردہ تھی۔

اسے کوئی تعجب نہ ہوا۔ آگے بڑھی۔ سڑک پر مردوں کا ہجوم تھا۔ بسیں اور ٹرامیں مردے چلا رہے تھے۔ دکانوں میں خرید و فروخت مردے کر رہے تھے۔ ایک تھیٹر ہال میں جھانکا اسٹیج پر "سوان لیک" میں مردے رقصاں تھے۔ اور تماشائی سب بے جان تھے۔

"یہ زومبی ہیں نا؟" اس نے ایک آدمی سے پوچھا جو تیز تیز قدم رکھتا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

"نیں نیں" اس آدمی نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر جواب دیا "زومبی نہیں مادموزیل خالص۔ اصلی مردے"

وہ آدمی بہت لمبا تھا۔ تاڑ کا تاڑ۔ گریٹ کوٹ میں ملبوس مفلر سے سر چھپائے مستقل مونچھوں پر ہاتھ رکھ کر بولتا تھا۔ اس کی آنکھیں ٹریفک کی بتیوں کی مانند کبھی سرخ ہو جاتیں کبھی سبز اچانک اس نے تمارا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا پنجہ لوہے کا تھا۔

"تمارا" اس نے نرمی سے کہا "اکسکیوز می" اور ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی ایک بس میں سوار ہو گئی۔

چاروں طرف دیکھا۔ شاید اس بس میں نصرت موجود ہو یہ اس کے ہوسٹل کی طرف جاتی ہے۔ نمبر پڑھ لیا تھا۔ ایک دفعہ نصرت مل جائے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

دفعتاً بس خالی ہو گئی۔ بغیر ڈرائیور مسافروں کے فراٹے بھرتی ایک پل سے گزر کر قبرستان کے پھاٹک پر رک گئی۔

یہ زندوں کا قبرستان ہے۔ تمارا نے اپنے آپ کو بتایا اب اسے ساری باتیں آپ سے آپ معلوم ہوتی جا رہی تھیں۔ میں چیزوں کو ان کے اصل بنیادی روپ میں دیکھ رہی ہوں۔

اندر جا کر اس نے ایک ائرکنڈیشنڈ قبر میں جھانکا۔ یہ ایک SPLIT LEVEL اندر رنگین ٹیلی ویژن کے سامنے زندہ لوگ بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ ٹیلی ویژن پر سنہرے بالوں والی یورپین نیلے چہرے

والی عورت "للی مارلین" گا رہی تھی۔ اس نے ۱۹۱۶ء کے فیشن کا لباس پہن رکھا تھا۔

گڑگڑاہٹ کے ساتھ خبریں شروع ہو گئیں۔ وہ خبریں سننا نہ چاہتی تھی اس لئے بھاگی۔

راستے میں دیکھا کہ جنازے قبرستانوں سے اُلٹے گھروں کی طرف جا رہے ہیں۔

قبریں زندوں سے بھر گئی ہیں جگہ نہیں ملی۔ اس نے اپنے آپ کو بتایا۔ اور شہر واپس آئی۔

یہاں حسبِ معمول ہر جگہ مردے ہی مردے تھے۔ دفتروں میں۔ کارخانوں میں ہر جگہ بعض مردوں نے پچھلی صدیوں کے لباس پہن رکھے تھے۔ اس کے سامنے ایک سولہویں صدی کا برطانوی بادشاہ اپنا تاج سیدھا کرتا ذرا جھینپا کیونکہ اس کا شاہی لباس بے حد شکن آلود اور بوسیدہ تھا۔ تابوت سے نکلا۔ تابوت گاڑی کو باوردی مردے کھینچ رہے تھے۔ اسلامی لیتا ایک بنک کی سیڑھیاں چڑھتا اور جا کر منیجر کی کرسی پر گُم صُم بیٹھ گیا۔ اور مٹی کے رنگ کی بھربھری داڑھی پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

باہر پارک میں اٹھارہویں صدی کی مردہ عورتیں سائیکل چلانے کی مشق کر رہی تھیں۔ ان کے منجمد چہرے مٹی کے تھے۔

"یہ ان لوگوں کو کیوں بلایا گیا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"جنرل لام بندی" ایک گیارہویں صدی کے نارمن کسان نے جواب دیا اور سر جھکائے پارک کی کیاری میں کدال چلاتا رہا۔ اس کے ہاتھ بالکل خشک اور سیاہ تھے۔

تب اس نے سوچا۔ وقت دعا ہے۔ توبہ استغفار۔ توبہ استغفار۔ ایک عظیم الشان صومعہ فوراً اس کے سامنے آ گیا۔ وہ سر پر رومال باندھ کر اس کے صدر دروازے کی طرف بڑھی۔ اندر رَبّی نمازِ عشار پڑھ رہا تھا۔ باہر دروازے کی محراب کے نیچے ایک آدمی گھٹنوں میں منہ چھپائے

بیٹھا سر پہ خاک ڈال رہا تھا۔

"معاف کیجئے گا آپ حضرت ایوبؑ ہیں۔" اس نے ادب سے جھک کر دریافت کیا۔

"نہیں۔ میں بلبلا بلبلا کر خدا کو پکارتا ہوں مگر منہ سے صرف گالیاں نکلتی ہیں۔" آدمی نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

"آپ ابلیس ہیں۔؟"

یا ابلیس یا مجذوب یا محض نروس بریک ڈاؤن کا شکار۔" اس نے جواب دیا اور مزید راکھ سر پر ڈالی۔

"آپ نے ایل۔ ایس۔ ڈی بہت نوش جان کی ہو گی۔ آپ کی روح کو کیا تکلیف ہے۔"

"روح۔ روح گئی چولہے بھاڑ میں۔ کیسی روح؟" اس نے جواب دیا اور بال نوچے۔

میں چیزوں کو ان کے بنیادی روپ میں دیکھ رہی ہوں۔ اس نے دل میں دہرایا اور خود کو بہت عاقل اور ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ وہ ایک انڈر گراؤنڈ ٹرین میں موجود تھی۔ ٹرین کبھی کھچا کھچ بھر جاتی۔ کبھی ایک دم خالی۔ اس میں دنیا بھر کی قوموں کے لوگ سوار تھے۔ اور زمین کے نیچے نیچے آواز سے زیادہ تیز رفتاری سے ساری دنیا میں گھوم رہی تھی۔ سرحدوں کے بعد سرحدیں۔

اور الجزائر

اور سائی

اور سعودیہ

اور۔

ٹرین سمندر کے نیچے سے نکل کر ایک تپتے ہوئے صحرا میں آ گئی اور لغیہ پٹریوں کے ریت پر چلنے لگی۔ اور گڑ گڑاتی ہوئی سامنے پیٹرا کے سرخ رومن کھنڈروں میں گھس گئی۔

اور ٹایر

اور صدون

اور نینوا۔

اُفق پر سنسان خیموں کے پردے باد سموم میں پھٹپھٹا رہے تھے۔ سارے میں جلی ہوئی رسیاں اور جلے ہوئے پردے اور بچوں کی ننھی منی جوتیاں بکھری پڑی تھیں۔ بہت دور دریا بہہ رہا تھا۔ اس کے کنارے ایک گھوڑا زور سے ہنہنایا اور کسی نے بڑی کربناک آواز میں پکارا۔ العطش العطش"

اس کے کیا معنی ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کیونکہ اُسے کوئی زبان نہ آتی تھی۔ سوا اپنی زبان کے۔ میں اب واپس جانا چاہتی ہوں۔ میں وہاں ہو آئی ہوں وہاں کچھ نہیں ہے پرچھائیاں کی پرچھائیاں بھی نہیں ہیں۔

لیکن آواز برابر گونجا کی۔ العطش

پھر ایک لرزہ خیز چیخ بلند ہوئی۔ العطش۔

اچانک سورج کی روشنی بہت تیز ہو گئی۔ تباہ شدہ خیمہ گاہ اب صاف بہت قریب نظر آ رہی تھی۔

"آج خیمہ گاہوں پر پھر بمباری کی گئی ہے۔"

جرمن نیوز کاسٹر نے کہا۔

تیسرے روز جب اس کی طبیعت سنبھلی اور وہ کلاس کے بعد لنچ کے لئے اسی کیفے ٹیریا میں

گئی۔ دریچے کے سامنے والی میز پر اس وقت دو ہندوستانی طالب علم بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ اُن کے سامنے تازہ اخبار رکھا تھا۔ جس میں ”نصرت الدین“ اور اس کے ساتھیوں کی مزید تصویریں اور تفصیلات چھپی تھیں۔ تمارا جلدی سے کاؤنٹر کے پاس جا کر قطار میں لگ گئی۔

بیاباں میں ہے۔

بیاباں میں ہے۔

دونوں طالب علم کسی اجنبی زبان میں بات کر رہے تھے۔ اور ان کے جوش و خروش سے اندازہ ہوتا تھا کہ شعر پڑھ رہے ہیں۔ (جیسے وہ فارسی اشعار اسے سنایا کرتا تھا)

اَلِس لینڈ کی طرح دنیا میں کتنی زبانیں ہیں جو تمارا کو نہیں آتیں، کتنے جذبات، تصورات، نظریے، خواب، کرب، اندوہ جن سے وہ واقف ہونا نہیں چاہتی۔ کافی کچھ جان جانے کے باوجود منتظر لالرک سے کانٹا چمچے اور پلیٹ اُٹھا کر وہ قطار میں آگے سرکی۔

قبا چاہیے۔ قبا چاہیے۔

اس کو خونِ عرب سے۔

سامنے سے تمارا گرین برگ کو اپنی ٹرے اُٹھائے آتا دیکھ کر وہ لڑکے معاً خاموش ہو گئے۔

٭